



اس کہانی پر مصنف کو پانچ ہزار روپے انعام دیا گیا

منزلِ صلیب

محمود احمد مدنی

شبم سے زیادہ پاک اور گلاب کی پتی سے زیادہ نرم و نازک عورت کے حقیقتاً کتنے روپ ہیں اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ جب وہ رنگ بدلتی ہے تو اسے پہچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک اپاہج اور معذور شخص کی انا کی صلیب پر لٹکی ہوئی اُس عورت کی کہانی جو فنا آسودہ تمناؤں کے بے کنار صحرا میں کسی آوارہ رُوح کی طرح بھٹک رہی تھی جسموں میں دپکے اس الاؤ کی رُوداد جو رفتہ رفتہ انسان کو راہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہر سراب کو حقیقت سمجھ کر دیوانہ وار اس کی طرف دوڑنے والے ایک تشنہ تن نوجوان کا قصہ بھی ہے جس کے لیے کوئی جائے امان نہیں تھی۔ محبت کی اس دھیمی آنچ کی کہانی جو شعلہ بنتی ہے تو سب کچھ ہمسم کر دیتی ہے۔

کمرے بھرے پہنے لگے اور مختلف ہل اور آڈیو ریم بھی روز کے گاہکوں اور تقریبات منعقد کرنے والوں سے آباد رہنے لگے تو مارکان نے سکھ کی سانس لی۔

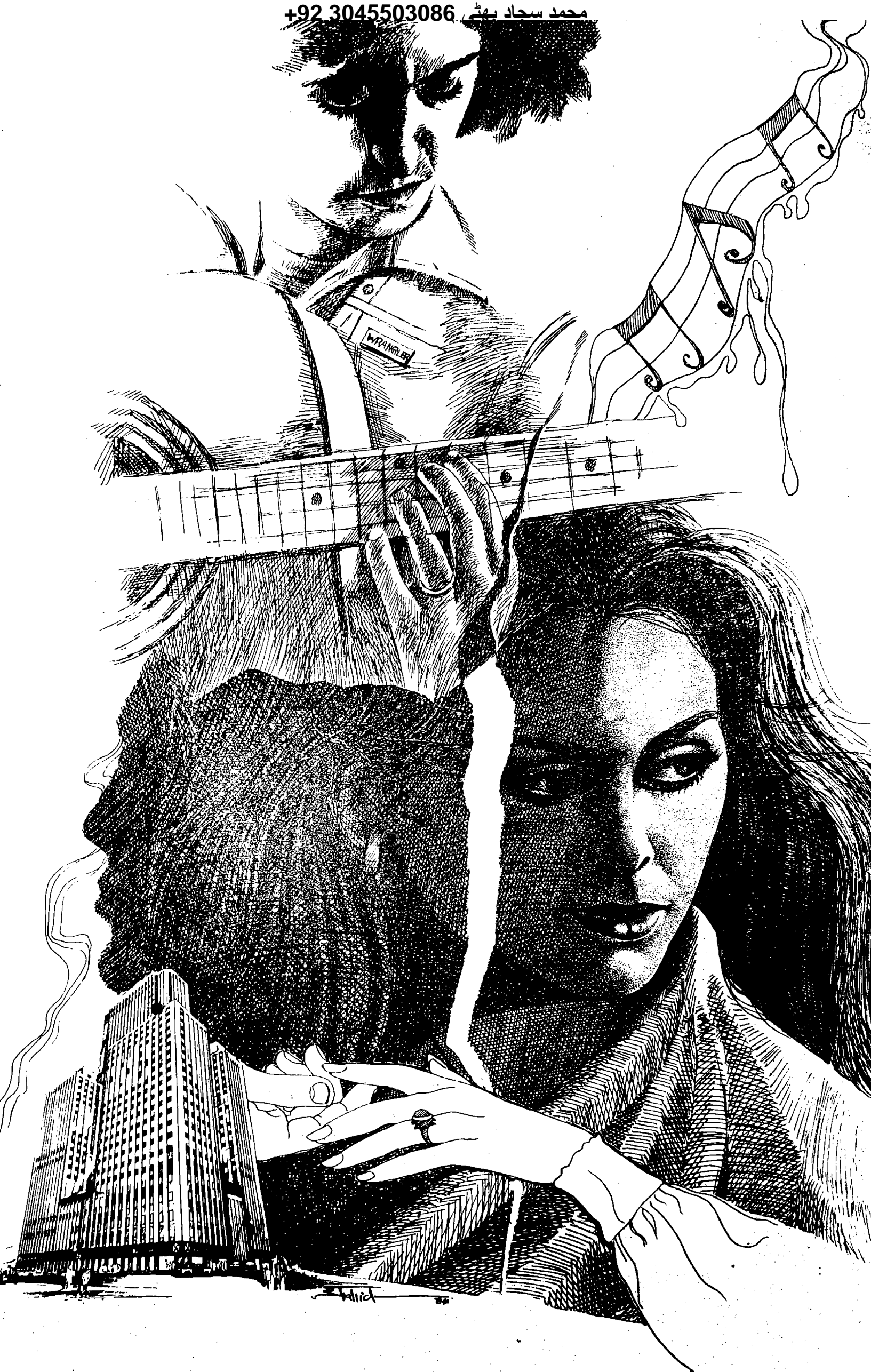
ایک عام تاثر یہ تھا کہ گرین لینڈ ہوٹل کی کامیابی میل س کے آرکسٹر کا بھی بڑا دخل تھا۔ یوں تو تھری اور فور اسٹار ہوٹلوں میں بھی بڑی چھان بین اور رد و کد کے بعد کل وقتی یا جزبہ وقتی آرکسٹر کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں لیکن گرین لینڈ والوں نے فائو اسٹار ہوٹلوں کی روایات سے کچھ ہٹ کر آرکسٹر کا انتخاب کیا تھا۔

انہوں نے آرکسٹر میں نہ صرف ان مشہور و معروف سازندوں کو جمع کیا تھا جو انگریزی دھنیں بجانے میں ماہر تھے بلکہ ان کے ساتھ چند ایسے سازندوں کو بھی شامل کیا تھا جو ملکی ساز استعمال کرنے اور لوک دھنیں بجانے میں ماہر تھے۔ دراصل مارکان کو احساس تھا کہ ولایت پلٹ سرمایہ داروں یا یورپ ہی میں پردریش پانے والے امیر زادوں میں بھی کبھی قومی ورثوں سے لگاؤ کی لہر جاگ اٹھتی ہے۔

اس ضمن میں ہوٹل کی گیسٹ ریلیشنز مینیجر یعنی انیسر مہانداری مس نسیمہ درانی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے پرنسپل مینیجر کے سامنے تجویز پیش کی کہ آرکسٹر میں ایک ایسے شخص

ایک نو تعمیر شدہ فائو اسٹار ہوٹل تھا۔ فائو اسٹار ہوٹل کی یوں تو اپنی ہی ایک شان ہوتی ہے اور اس کی تعمیر کے دوران ہی اس کی تشریری مہم شروع ہونے سے پہلے پہلے ہی اس کی شہرت کی خوشبو شہر میں پھیل جاتی ہے۔ دولت مند ہی نہیں شہر کے بیشتر کنگلے بھی اتنی توجہ اور انہماک سے اس کا تذکرہ سنتے ہیں گو یا اس کی تعمیر مکمل ہوتے ہی بلاناغہ دہاں جانا شروع کر دیں گے یا شاید مستقل طور پر ہی ایک سوٹ دہاں ریڑ رو کر لیں گے۔ حالانکہ ہوٹل کی تعمیر کے دوران اور تعمیر مکمل ہونے کے بعد بھی ہوٹل سے انہیں صرف اسی حد تک استفادہ کرنا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بس میں لٹک کر اس کے سامنے سے گزرتے وقت ایک حسرت بھری نظر اس کی بلند و بالا عمارت پر ڈال لیا کریں۔

نو تعمیر شدہ فائو اسٹار ہوٹل گرین لینڈ ہوٹلوں کے مشہور عالم سلسلے کی ایک کڑی تھا اور تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی شہرت شہر میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ اب بھی عالم یہ تھا کہ اس کی صرف تین منزلوں کی تزیین و آرائش مکمل ہوئی تھی باقی سات منزلوں میں کام جاری تھا مگر ہوٹل کو جزوی طور پر کاروبار کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ ہوٹل کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اندیشہ تھا کہ ہوٹلنگ کا بزنس کچھ مندا جا رہا ہے۔ اس لیے ان کا کروڑوں روپیہ بھی کہیں خطرے میں ہی نہ پھنسا ہے۔ لیکن جب



جو ہڈی نذر احمد کے لڑکے نے مراٹھوں والے کا شروع کر دیے۔
میں نے سنا ہے تم نے لوگوں کی محفلوں میں جا کر بھی گانا شروع
کر دیا ہے۔ اگر میں نے ایسے کسی موقع پر تمہیں دیکھ لیا تو شاید
میرے ہاتھوں تمہارا قتل سرزد ہو جائے۔

اس سے پہلے ظفر نے بال بڑھائے، حین پہنا شروع کی بڑے
بڑے پھولوں والی شہر میں استعمال کرنا شروع کیں، مونچھیں منڈائیں
کبھی بڑھائیں۔ غرضیکہ ہر فیشن کا ساتھ دیا مگر باپ نے کبھی غفگی
کا اظہار نہیں کیا لیکن اس گانے سبب نے والے معاملے پہ آ کر سوئی
اتک کر رہ گئی۔

بالا خر باپ نے ایک روز فیصلہ کن لمحے میں کہہ دیا کہ اگر ظفر
نے گانا بجانا نہ چھوڑا تو وہ اسے عاق کر دے گا۔ ظفر نے اسے محض
ایک جوشیلی دھمکی سے تعبیر کیا لیکن باپ نے ایک روز اس دھمکی
پر عمل کر دکھایا۔ اخبار میں اشتہار بھی چھپوا دیا اور ایک روز وکیل
کی معرفت ظفر احمد کو تو تھیقی خط بھی موصول ہو گیا۔

ظفر احمد کا دل ذرا ڈگمگا یا ضرور۔ مگر ایک تو باپ والا
نخرہ بھڑا بہت اس میں بھی تھا۔ دوسرے وہ باپ کا اکلوتا بیٹا تھا
اسے قوی امید تھی کہ باپ کی یہ ناراضگی عارضی ثابت ہوگی۔ اس لیے
وہ اس ساری کارروائی پر بھی دم سادھ کر بیٹھ رہا۔ البتہ اس کی
آواز کا سوز کچھ بڑھ گیا۔

شب و روز گزرتے گئے۔ ظفر احمد اپنے گاؤں تو لڑکپن
ہی سے شاذ و نادر ہی جاتا تھا، اب تو گویا ناتاہی ٹوٹ کر
رہ گیا۔ باپ سے تجدید تعلق کی جو امید اس کے دل میں جاگزیں تھی
وہ بھی دھیرے دھیرے دم توڑ گئی۔ دراصل دونوں طرف ہی انا
کی دیواریں بلند تھیں اور کوئی بھی انہیں گرانے پر تیار نہیں تھا۔ جھکنا
بھی دونوں میں سے کسی کی سرشت میں نہیں تھا۔ ظفر احمد کی ماں
زندہ ہوتی تو اپنی مامتا سے مجبور ہو کر اس خلیج کو پاٹنے کے
جتن کرتی۔

معاشی شہر رگ کٹ جانے کے بعد زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے
میں شروع شروع میں ظفر احمد کو خاصی دشواریاں پیش آئیں۔
پہلے اسپورٹس موٹر سائیکل بچی پھر گھڑی، پھر سونے کالا کٹ اور
اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ۔ جب بیچنے کو کچھ نہ رہا تو ظفر احمد نے
لوکری کی تلاش شروع کی۔

اس کے بعد کے دو برسوں میں اس نے کئی چھوٹی چھوٹی
لوکریاں کیں۔ کسی جگہ مالک کو اس کا رویہ پسند نہیں آتا تھا اور
کیس لے مالک کا طرز عمل نہیں بھاتا تھا۔ یوں کہیں بھی اس کی
زیادہ دیر نہ بھتی نہیں تھی۔ بہر حال زندگی اب اس کے لیے اتنی
خوفناک نہیں رہی تھی۔ قد سے تنگ دستی سے ہی سہی لیکن اسے

کو بھی شامل کیا جائے جو نہ صرف کوئی مشرقی ساز بجانے میں ماہر ہو
بلکہ حاضرین کی فرمائش پر لوک نغمے یا کوئی اور گانا وغیرہ بھی سنا
سکے۔ پرسنل مینجر کے خیال میں یہ چیز فائیدہ ساز ہو لڑکے کے معیار
اور روایات کے کچھ زیادہ ہی خلاف تھی لیکن نیند وڑانی نے بورڈ
آف ڈائریکٹرز سے اپنی اس تجویز کی منظوری حاصل کر لی۔

یوں گریپ لینڈ کے آرکسٹر میں باقاعدہ تقرری کے ذریعے
ظفر احمد کو شامل کیا گیا اور اسے ہاؤس سیکر کا نام دیا گیا۔
ظفر احمد تقریباً ستائیس سال کا ایک ڈبلا پتلا، گورا چٹا،
خوش شکل نوجوان تھا اور چہرے ہرے سے اور بھی کم عمر لگتا تھا۔ اس
کا بچپن گاؤں میں لیکن لڑکپن اور جوانی شہر میں گزری تھی اور کچھ گزر
رہی تھی۔ اس کا باپ ایک چھوٹا سا زمیندار تھا۔ جس نے بڑی امنگوں
اور ارمانوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو کم عمری میں ہی پڑھنے کی غرض
سے شہر بھیج دیا تھا۔

پڑھنے لکھنے سے ظفر احمد نے کبھی جی نہیں چرایا۔ وہ بہت
زیادہ پڑھا کر اور لڑکھوٹا قسم کا طالب تو کبھی نہیں رہا تھا تاہم آ
غبی بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ٹیچر کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں
رہی تھی لیکن جس طرح بعض نوجوانوں کو سگریٹ پان کی، کسی کو چرس
کی اور کسی کسی کو تو شراب یا کسی اور مہلک نشے کی لت لگ
جاتی ہے، اس طرح ظفر احمد کو لڑکپن سے موسیقی کی لت لگ گئی اور
گلوکاری کا شوق پیدا ہو گیا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوایں۔ باپ اکثر گاؤں سے
ظفر احمد کے ہسٹل آتا رہتا تھا۔ اس نے کمرے میں کتابوں کے ساتھ
ساتھ طبلہ، سارنگی، ہارمونیم اور وائلن سب سے دیکھے تو پہلے پہل پیار
بھرا انداز میں سرزنش کی، اس کے بعد ڈانٹا بھٹکارنا شروع کیا
پھر غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا مگر کوئی طریقہ کام نہ آیا۔ موسیقی
گلوکاری کا شوق عشق کی طرح ظفر کے سر پہ سوار تھا اور اس کے
پاس اس کے حق میں ان گنت دلیلیں تھیں۔

باپ اس قسم کے مذہبی آدمیوں میں سے تھا جو نماز رونے
کے پابند نہیں ہوتے لیکن بیشتر مذہبی معاملات میں ان کا رویہ...
ناقابلِ ترمیم ہوتا ہے۔ اور پھر موسیقی کے معاملے میں تو سوال
مذہب ہی کا نہیں، خاندانی عزت کا بھی تھا۔ کوئی پانچ یا چھ
پیشیتیں پہلے ان کے خاندان میں کسی خزانہ کی سجادہ نشینی بھی سہا کرتی
تھی جو نہ جانے کس جھگڑے میں ان سے چھن گئی تھی مگر باپ ابھی
تک باتوں میں اس کا حوالہ دیا کرتا تھا اور زمین گو کہ ساتھ ستر ایکڑ
ہی تھی مگر زمیندارانہ شان و شکوہ اس پر مستزاد تھا۔

لوگ کیا کہیں گے۔۔۔۔۔؟ وہ اپنی تیل چھڑی مونچھوں کو
بل دیتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ لے لے لے زمیندار اور خاندانی سجادہ نشین

اپنے پیروں پر کھڑا ہونا آتا جا رہا تھا۔

اس دوران شوق کی آبیاری بھی جاری تھی۔ چھوٹی موٹی محفلوں میں بعد شوق لوگ اسے گانے بجانے کے لیے بلاتے رہتے تھے لیکن ان محفلوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رات گئی بات گئی، والا معاملہ ہوتا تھا۔ ظفر احمد کے دل میں آگے بڑھنے اور اوپر آنے کی جھلک جو تپش موجود تھی ان محفلوں سے اس کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی، اسے قرار نہیں آ سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی البتہ یہ ضرور آتی تھی کہ پہلے اگر کبھی کوئی اس قسم کی محفلوں میں گلوکاری کے معاوضے کی بات بھی کرتا تھا تو ظفر بڑا مات جاتا تھا لیکن اب اگر کوئی سو دو سو روپے بھی اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا تو وہ واپس کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

ایسی ہی ایک نجی محفل میں اس کی ملاقات گرین لینڈ ہوٹل کی افسر مہمانداری مس نسیمہ ڈرائی سے ہو گئی تھی۔ اس سے اگلے روز نسیمہ نے پرسنل منیجر کے سامنے ہوٹل میں ایک عدد 'ہاؤس سنگر' کی اسامی پیدا کرنے کی تجویز رکھ دی تھی اور اس سے ہمت افزا جواب نہ پا کر اس نے ظفر احمد کو براہ راست مائکان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

ظفر احمد اس روز اپنی عمدہ ترین قمیص شلوار پہن کر جوتے چمکا کر اور ایک شیشی کی تہہ میں بچا کھچا کھن اپنے اوپر چھڑک کر انٹرویو کے لیے پہنچا تھا۔ انٹرویو کے دوران ایک مرحلے پر جب نسیمہ ڈرائی نے محسوس کیا کہ مینجنگ ڈائریکٹر جس کے ہوٹل میں سب سے زیادہ شیراز تھے، تھے سے اٹھ کر رہا ہے تو وہ جلدی سے بولی۔ "سیٹھ صاحب! آپ اس نوجوان سے کچھ سن کر تو دیکھیے۔"

چاروں ڈائریکٹر کی رضامندی سے ظفر احمد نے اینڈکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف دفتر کی ایک میز ہی سے طبلے کا کام لیتے ہوئے ایک گانا شروع کیا۔

رہا گر دشوں میں ہر دم میرے عشق کا ستارا

کبھی ڈمگانی کشتی کبھی کھو گیا کنارا

اس کی آواز صیح طور پر اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار وہ اتنے بڑے سیٹھوں کے سامنے گارہا تھا جن میں سے ہر ایک کو شہر میں بزنس مینگیٹ سمجھا جاتا تھا۔ وہ پریشان تھا کہ ان کا ذوق نہ جانے کتنا بلند ہو اور کسی سُر کے اوپر نیچے ہو جانے سے ان میں سے کوئی سیٹھ بڑا ہی نہ مناجائے۔ بہر حال اس نے جلد ہی اپنی آواز کو سنبھال لیا۔

گانا ختم ہونے پر مینجنگ ڈائریکٹر صاحب بولے۔ "اے اپنا جگر صاب! یہ گانا مانا تو بالکل ٹھیک ہے اور یہ کسٹی کا

ڈمگانا بھی ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر اپنی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ سالانہ کنارا کیسے کھو گیا نہیں۔۔۔۔۔ کدھر کھو گیا نہیں۔۔۔۔۔ کنارا نا تو پہاڑ کے مافک اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے۔۔۔۔۔"

نسیمہ ڈرائی نے ظفر احمد کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں سے بے بسی جھانک رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے اور گو یا صورت حال کو سنبھالتے ہوئی بولی۔ "یہ شاعری داعری تو ایسے ہی ہوتی ہے سیٹھ صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آواز تو ٹھیک ہے نا؟ مہمانوں کو بھڑکا دے گی۔ مرغی کے مافک۔"

"تم بولتی ہو تو پھر ٹھیک ہی ہو گائیں: مینجنگ ڈائریکٹر صاحب نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی اپنا آدھا بزنس تو تمہارے سر پر چلتا پڑا ہے۔ اب تم اس چھوکرے کو ادھر بینڈ ماسٹر کے پاس لے جاؤ۔ وہ دیکھ لیوے کہ اس کو کیا کچھ بجانا آتا ہے۔ وہ اس کو پاس کر دیوے تو پھر اپنا پرسنل صاحب اس کو نوکری کی چٹھی دلا دو۔ ٹھیک؟"

خوش قسمتی سے ان مراحل سے بھی ظفر احمد بحسن و خوبی گزر گیا اور بالآخر اپائنٹمنٹ لیٹر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ نوکری اس کی افتاد طبع کے عین مطابق تھی۔ کام و ام کوئی خاص نہیں تھا۔ تنخواہ معقول اور ماحول نہایت دلکش۔ اس کے کام کا وقت ضابطے کے مطابق چھ بجے شام کو شروع ہوتا تھا لیکن وہ چار بجے ہی آکر ہوٹل کے کافی بار میں بیٹھ جاتا تھا۔

چھ بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تو وہ بال روم میں آکر آرکسٹر میں شامل ہو جاتا اور ضرورت پڑنے پر کوئی ایک آدھ ساز بجانے لگتا۔ ورنہ فاسغ ہی بیٹھا رہتا۔ بال روم میں رات دس بجے کے بعد گاہکوں کی آمد و رفت شروع ہوتی تھی۔ کچھ جوڑے رقص کرتے، کچھ ان کی نقل کرتے اور کچھ بیٹھ کر محض انہیں دیکھا کرتے۔ گاہکوں کی اطلاع کے لیے آرکسٹر کے اسٹیج کے پیچھے دیوار پر جلی حروف میں انگریزی میں یہ اعلان بھی لگا دیا گیا تھا کہ معزز مہمان چاہیں تو لوک دھنوں یا نغموں وغیرہ کی فرمائش بھی کر سکتے ہیں۔ مگر شاذ و نادر ہی کوئی مہمان اس اعلان کو درخور اعتنا سمجھتا تھا۔

بیشتر ویٹرز، کافی بار میں کام کرنے والی ویٹریس، کاؤنٹر کلرک، استقبالیہ کلرک اور عملے کے دیگر بہت سے افراد ظفر احمد کو پہچاننے لگے تھے کیونکہ وہ وقت سے پہلے آکر چائے یا کافی وغیرہ پینے کے دوران انہی لوگوں سے گپ شپ کرتا رہتا تھا۔ کافی بار کے ادھیڑ عمر کاؤنٹر کلرک تصدق حسین اور ویٹریس شازیہ سے تو اس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

تصدق حسین ایک کم گو اور بال بچے وار شخص تھا لیکن ظفر احمد کی خوش خلقی کی بنا پر اس سے گھل مل گیا تھا اور گھر لیو مسائل پر بھی اس سے تبادلہ خیال کر لیتا تھا۔

دیپتیس شازیہ فرہی مائل سرخ و سپید لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بال بھوسے تھے۔ عمر پچیس پچیس سال رہی ہو گی۔ نقوش بے حد عام سے تھے لیکن روزانہ شام کو وہ یونیفارم کے طور پر بھڑکتے نارنجی رنگ کی چست شلوار قمیص اور بڑا نوئی ایئر ہوٹسٹوں جیسی ٹوپی پہن کر چھوٹی چھوٹی میزوں کے درمیان چکراتی تھی تو بلاشبہ قیامت ڈھاتی تھی۔ تعلیم اس کی صرف الیٹھائی تھی لیکن بچپن میں انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے کا موقع مل گیا تھا جس کے اثرات ابھی تک باقی تھے اور وہ نہ صرف انگریزی سمجھتی تھی بلکہ خاصی روانی سے بول بھی لیتی تھی۔ اسے ملازمت دلانے میں اسی صلاحیت کا سب سے زیادہ دخل تھا۔

کہنے کو تو شازیہ دیپتیس تھی لیکن اس کی تنخواہ دو ہزار کے قریب تھی کیونکہ صرف مشروبات سرو کرنا ہی نہیں، بعض گاہکوں کے گھٹیا ذہنوں کے اُبال اور سو قیام مذاق کو برداشت کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ٹپ بھی اسے خوب ملتی تھی۔ اسی لیے وہ اکیلی نو افراد کے کنبے کی ضرورتیں برسن خوبی پوری کر رہی تھی۔

کافی بار ہی ہوٹل کا وہ واحد حصہ تھا جہاں عموماً مڈل کلاسیوں کی بھی رسائی رہتی تھی جنہیں یا تو کوئی آسودہ حال آدمی کسی کام کی غرض سے وہاں ملنے کا وقت ملے دیتا تھا یا پھر وہ خود ہی سو پچاس روپے جیب میں ڈال کر 'عتیاشی' کی غرض سے وہاں آ بیٹھتے تھے اور چودہ روپے کی چائے کے ساتھ دیپتیس کو پیسٹری کے طور پر شامل سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو شازیہ پیٹھ پیچھے موٹی موٹی گالیاں دیا کرتی تھی۔

انسر مہانداری سید درانی بھی کبھی کبھی فاسخ وقت میں کافی بار میں آ بیٹھتی تھی۔ ظفر احمد اس کے آگے بچھا جاتا تھا۔ وہ جب بھی شکر گزاری کے اظہار کے لیے خوبصورت ترین الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور الٹ الٹ کر انہیں ادا کرتا تھا تو وہ مریبانہ انداز میں مسکراتی تھی اور بھرپور خیال انداز میں اس کی آنکھوں میں بھانکتے ہوئے سوچوں کی نہ جانے کونسی مہول بھلیوں میں بھٹک جاتی تھی۔

کافی بار میں ہی ظفر نے پہلی مرتبہ اس عورت کو دیکھا تھا اور دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ عورت تھی ہی ایسی کہ اسے دیکھتے وقت ہلک جھپکا نا بڑا تکلیف دہ عمل محسوس ہوتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے کم نہیں رہی ہو گی لیکن اس کے حسن اور کشش کا چاند ذرا بھی تو نہیں گمنایا تھا۔

اس کا سراپا اس کے ہوئے سیلے پھل سے مشابہ تھا

جو کسی بھی لمحے شاخ سے ٹوٹ کر گرنے والا ہو اور جس میں ان گنت پھولوں کی مہک بھی مقید ہو..... اور جس تک پہنچنے کے لیے نہ جانے کتنے ہاتھ کوشاں رہے ہوں مگر کامیاب کوئی بھی نہ ہو سکا ہو۔ بعد میں ظفر کو اور بہت سی باتوں کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی شادی کو کم از کم بارہ برس کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن ظفر نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو بھی سمجھا تھا کہ شاید وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے لیے ہم پلہ رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی شادی میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے۔

اس روز وہ فریج شیفر کی سفید ساری میں تھی۔ جو بڑی اپنائیت سے اس کے بھرے بھرے جسم کے نشیب و فراز سے چھٹی ہوئی تھی۔ اس کا ذہن عورتوں سے نکلتا ہوا اور نگت محض گوری ہی نہیں، اس میں ماہتاب کی سی چمک بھی تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں جھیل کی طرح نہیں، سمندر کی طرح گہری تھیں جن کی تہ میں جانے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی دیوی کا سا تقدس اور چال میں کسی ملکہ کی سی تکنت تھی۔ اس کے ملکوتی حسن کو لفظوں میں بیان کرنا ظفر کے خیال میں ناممکن ہی تھا۔ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

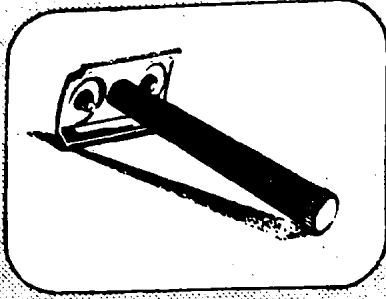
اس کی آمد سے جیسے کافی بار کے دھندلائے ہوئے سے ماحول میں اجالا پھیل گیا تھا۔ اس نے کافی بار کا وہ پردہ اٹھایا جو موٹے موٹے موتیوں اور منکوں کی لڑکیوں سے بنا ہوا تھا۔

اور جسے چھپڑنے پر مترنم سی گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں۔ بظاہر اس نے کسی طرف بھی نہیں دیکھا تھا لیکن ظفر نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں اس چھوٹے سے ہال کا جائزہ لے چکی تھی اور نہ جانے کس چیز کا اطمینان کرنے کے بعد کاؤنٹر کی طرف بڑھتی تھی۔ ایک مسکور کن خوشبو کا جھونکا اس کے ہم رکاب تھا۔ کافی بار میں اس وقت کوئی گاہک نہیں تھا۔ ظفر ایک گوشے میں آخری میز پر بیٹھا تھا اور مہوت کر دینے والی اس عورت کی آمد سے پہلے چائے ختم کر کے میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور اسٹیکس کے عجیب عجیب ناموں پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اس عورت کو دیکھنے کے بعد وہ میز کی طرف دوبارہ متوجہ ہونا بھول گیا تھا۔

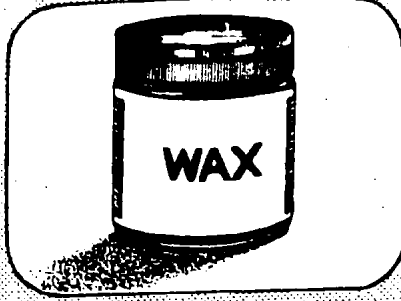
کاؤنٹر انگریزی کے حرف ایل کی ساخت کا تھا۔ شازیہ اس کے ایک سرے پر اسٹول پر بیٹھی تھی۔ وہ عورت کاؤنٹر کے دوسرے سرے کی طرف آ رہی تھی۔ جہاں تصدق حسین اس کے استقبال کے لیے اس عالم میں کھڑا تھا کہ انکساری اور اشتیاق سے اس کی باپھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ شازیہ نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف میزوں پر سر دھرتی تھی۔

اس کا سر اپا اس کے ہوئے سیلے پھل سے مشابہ تھا

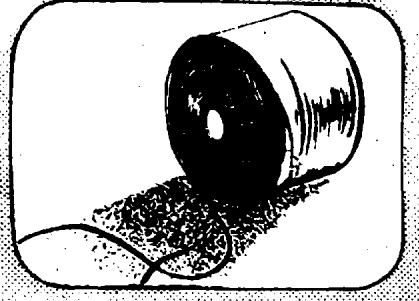
ایک عورت کی جلد کس حد تک تکلیف برداشت کر سکتی ہے؟



ٹیمپلک غیر نسوانی طریقہ ہے۔ جلد کو دردناک
کرتا ہے۔ بالوں کی سرس اشد کا باعث
ہوتا ہے۔



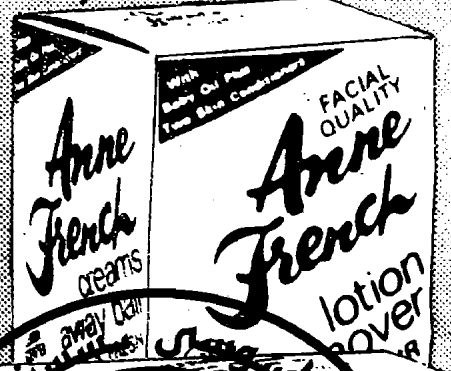
ویکسنگ کا پیچیدہ اور تکلیف
بالوں کو کھینچ کر نکالنے سے جلد ڈھیل
پڑ جاتی ہے۔



تھرڈ ہینڈ تکلیف دہ ہے اور بال فرسے
جلد کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔

غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے کا نسوانی انداز۔ این فرینج

خواتین کی نازک جلد کو نرم برتاؤ کی ضرورت
ہوتی ہے اور این فرینج ٹرمی کے ساتھ جلد کو
صاف و ملائم کر دیتی ہے۔
پڑا اثر این فرینج جلد کی تہہ تک پہنچ کر بالوں کو
نفاس سے صاف کرتی ہے۔
این فرینج کا استعمال نہایت آسان۔
محرم لگا کر کچھ دیر انتظار کریجئے اور پھر
صاف کر دیجئے۔
این فرینج لیجئے۔ کیونکہ اچھائی ہمیشہ بول
اٹھتی ہے۔ خصوصاً آپ کی جلد پر۔



تین خوشبودن میں دو سیلاب
گلاب، لیمون، ہیریل

کاؤنٹر کے سامنے اسٹولوں پر بیٹھنے والوں کو تصدق حسین ہی سرو کرتا تھا۔

وہ عورت تصدق حسین کے عین سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس طرح اس کے جسم میں کچھ ایسا تغیر آیا کہ اس پر نظر ڈالنا ہی گویا قیامت کا باعث ہو گیا۔

ظفر گو کہ کاؤنٹر کے اس سرے سے خاصے فاصلے پر بیٹھا تھا لیکن کافی بار میں سکوت اتنا زیادہ تھا کہ تصدق حسین نے جب مدھم لہجے میں بات شروع کی تو ظفر کو اس کی آواز خاصی حد تک صاف سنائی دی۔

”آپ بہت دنوں بعد نظر آئی ہیں بیگم رتیسہ رفیق!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ظفر احمد کو حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا کہ وہ عورت بیگم تھی۔ اب تک اسے بیشتر بیگمات ایسی ہی نظر آئی تھیں کہ اس کے ذہن میں تصور بیٹھ گیا تھا کہ بیگم صاحبہ کہلانے کے لیے عورت کا چمر بنی زدہ اور بے کشش ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جواباً عورت بھی گو کہ مدھم ہی لہجے میں بولی تھی مگر اس کی آواز کی کھنک نے ظفر کے دل میں گدگدی سی کردی۔ ”رفیق کی طبیعت گزشتہ دنوں کچھ زیادہ خراب رہی“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرا زیادہ تر وقت ملک بھر کے ہسپتالوں سے مزید نامور قسم کے اسپیشلسٹوں کو تلاش کرنے میں صرف ہوتا رہا۔ زندگی میں جو تھوڑی بہت تفریح کی گنجائش تھی وہ بھی ختم کرنا پڑی۔“

”اوہ۔۔۔“ تصدق حسین نے ہمدردانہ لہجے میں محض اتنا کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بات کرنے میں اپنی طرف سے حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا کہ کوئی فاضل اور غیر ضروری لفظ زبان سے نہ نکلنے پائے۔

”لاؤ! ہماری بلیک کافی تو نکالو“ بیگم رتیسہ رفیق نے قد سے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ گھر پر تو پیتی رہی ہوں مگر یہاں بیٹھ کر اور خصوصاً تمہارے ہاتھ کی بلیک کافی پینے میں جو مزہ ہے وہ گھر پر کہاں۔“

تصدق حسین نے مزید خاکسارانہ انداز میں اپنے دانتوں کی نمائش کی۔ اپنی بو درست کی اور کاؤنٹر کے نیچے سے ایک بلویں جگ نکال کر کاؤنٹر پر رکھا۔ پھر اس نے موی کاغذ میں لپیٹا ہوا جراثیم سے پاک ایک مگ نکال کر احتیاط سے کاؤنٹر پر رکھا اور اس میں کافی اندیل کر بیگم رتیسہ رفیق کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے پہلے چکھنے کے سے انداز میں چسکی لی۔ پھر دو تین بڑے بڑے گھونٹوں میں مگ خالی کر کے تصدق حسین کی طرف بڑھادیا۔

”ایک مگ سے تو گویا طلب ہی پوری نہیں ہوئی“ وہ

مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ایک اور مہر دو۔“

تصدق نے مگ دوبارہ مہر دیا۔ بیگم رتیسہ رفیق نے اسے بھی پہلے ہی کی طرح ختم کیا اور اس کے بعد وہ کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر گویا مراقبے میں چلی گئی۔ کافی بار میں پھسلا ہوا سکوت کچھ اور گہرا ہو گیا۔ شازبہ نے اپنے اسٹول پر دو ایک مرتبہ پہلو بدلا۔ پھر اٹھ کر کافی بار سے باہر جا کھڑی ہوئی۔ تصدق حسین اس دوران کاؤنٹر صاف کرنے، کافی اور انیکس وغیرہ بنانے کی مشینوں کا جائزہ لینے میں اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کئی منٹ بعد بیگم رتیسہ رفیق نے سر اٹھایا اور یوں گرد و پیش کا جائزہ لیا جیسے محض اچھلتی سی نظروں سے دیواروں کو دیکھ رہی ہو۔ لہذا ہر اس نے گویا ظفر کو بھی نہیں دیکھا تھا لیکن ظفر کو احساس تھا کہ وہ اس کا تفصیلی جائزہ لے چکی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تنہا ایک گوشے میں بیٹھا کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا۔

بیگم رتیسہ رفیق کی آنکھوں میں عجیب سی نمی جھلک آئی تھی جو کافی بار کی مدھم روشنی میں سیال چاندی کی طرح جھللا رہی تھی۔ رخساروں پر میک اپ کی ہلکی سی سرخی تو پہلے سے موجود تھی لیکن اب رخسار کچھ عجیب سے انداز میں تھما رہے تھے۔ گرد و پیش کا غیر محسوس انداز میں جائزہ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر تصدق حسین کی طرف متوجہ ہوئی اور مضمل سے انداز میں مسکرائی۔ کافی بار میں داخل ہوتے وقت وہ جتنی تازہ دم اور شکستہ نظر آ رہی تھی۔ اب اتنی ہی تھکی تھکی اور دل شکستہ سی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس سے اس کے حسن و کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے چہرے کے گرد تو جیسے ایک عجیب سا ہلکے نظر آنے لگا تھا۔ جس نے اس کے ایک ایک نقش میں غضب کی ملامت پیدا کر دی تھی۔

تصدق حسین نے اس کا اشارہ پا کر بل جسے ازراہ شائستگی ’جیک‘ کہا جاتا تھا، بیگم رتیسہ رفیق کے سامنے رکھ دیا۔ بیگم رتیسہ رفیق نے اسے فولڈر میں سے نکالا اور ادائیگی کرنے کے بجائے اس پر دستخط کر دیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جب دروازے کی طرف چلی تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں تلے ماربل کا فرش نہیں کوئی جھیل ہے جس کی سطح پر کنول کھلے ہوئے ہیں اور جن پر پاؤں رکھتی ہوئی وہ ایک کنالے سے دوسرے کنالے کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی کمر کے لہراؤ کے سامنے شاخ گل کی لچک بیچ تھی۔

وہ جا چکی تو جیسے رنگ خوشبو، چاندنی، موسیقی اور



چم
چم
چم



FLOSS

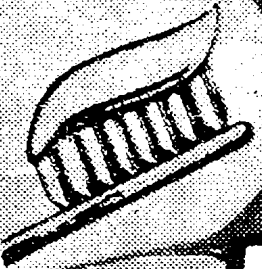
gets your teeth their whitest

great tasting gel

FLOSS

transparent toothpaste

FLUORIDE
VITAMINS C AND D



چمکاتے دانت ہر دم
مہکاتے سانس ہر دم

فلاس

ٹرانسپیرنٹ ٹوتھ پیسٹ

جو چاہیں سوکھائیں مگر اپنے دانتوں کی
حفاظت فلاس ٹرانسپیرنٹ ٹوتھ پیسٹ
سے کریں۔

فلاس میں ایسے اجزاء موجود ہیں جو
آپ کی سانس کو خوشگوار رکھتے ہیں۔
اس میں شامل فلورائیڈ اور
وٹامن سی اور ڈی دانتوں اور مسوڑھوں کی
صحت کے ضامن ہیں



خوبصورتی سے سجایا ایک مسحور کن خواب ٹوٹ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس دوران طفر ایک بے عنوان سے سحر میں گرفتار رہا تھا لیکن اس کے باوجود یہ عمل کئی پہلوؤں سے اس کے دل میں کھٹکا تھا۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ کافی بار میں آکر اسٹول پر بیٹھا ہی بیگم رئیسہ رفیق جیسی عورت کے شایان شان معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ڈاننگ ہال میں بیٹھ کر بھی کافی طلب کر سکتی تھی دوسری بات یہ کہ تصدق حسین کاؤنٹر پر بیٹھنے والے گاہکوں کو ہمیشہ کاؤنٹر پر رکھے ہوئے جگ یا پیر کیو لیٹر سے کافی نکال کر دیتا تھا۔ جبکہ بیگم رئیسہ کے لیے اس نے خاص طور پر کاؤنٹر کے نیچے سے وہ خوبصورت بلوریں جگ نکالا تھا جو طفر احمد نے آج سے پہلے کافی بار میں نہیں دیکھا تھا اور پھر اس نے جو کافی 'مگ' میں انڈلی وہ سیاہی مائل نہیں شفاف سرخ تھی۔ پھر رئیسہ رفیق نے جس انداز میں غٹ غٹ کر کے اسے پیا تھا۔ اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ کافی ذرا بھی گرم نہیں تھی۔ جبکہ بلیک کافی طلب کرنے کا مطلب ہی گرم کافی طلب کرنا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر دو 'مگ' ختم کر کے بیگم رئیسہ رفیق کے چہرے اور آنکھوں میں جو تبدیلی آتی تھی وہ.....!

یہ سب کچھ طفر احمد کے لیے تعجب خیز ضرور تھا لیکن کوئی ایسا معما نہیں تھا جسے وہ حل نہ کر پاتا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی اس کی ڈیوٹی شروع ہونے میں خاصی دیر تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تصدق حسین کے عین سامنے اسی اسٹول پر جا بیٹھا جس پر کچھ دیر پہلے تک لباس میں لپٹا ہوا وہ شعلہ برآ جان تھا۔

”بڑی اونچی چیز ہو تم بھی چچا تصدق!“ وہ آہستہ سے کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر بولا: ”تمہارا تو وہ معاملہ ہے کہ..... وہ الگ ہانڈھ کے رکھا ہے۔۔۔ جو مال اچھا ہے۔۔۔ کبھی کبھار ہیں بھی اسی جگہ میں سے بلیک کافی پلا دیا کرو جو وہ رُخوں کے لیے رکھا ہوا ہے۔ آخر قیمت تو ہماری تنخواہ میں سے ہی کٹی ہے کیا ہوا جو مٹھوڑی بہت رعایت مل جاتی ہے؟“

تصدق حسین کے ہونٹوں پر خشکی آچکی تھی جسے دُور کرنے کے لیے وہ ان پر زبان پھیرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا: ”میں تو تمہیں سیدھا سادا دیہاتی سمجھتا تھا! تم تو خاصی کینی چیز ہو۔“

”سیدھا سادا تو میں ضرور ہوں اور دیہاتی بھی ہوں۔“ طفر بولا: ”لیکن احمق ہرگز نہیں ہوں۔ جس شخص نے نگہ میں ایک بار بھی یہ قاتمی ہوش و حواس بلیک کافی پی ہو۔ وہ گرم

اور بلیک کافی میں فرق دُور سے محسوس کر سکتا ہے۔۔۔ لیکن یہ چکر کیا ہے؟“

”چکر کچھ بھی نہیں۔ تصدق حسین گہری سانس لے کر اور نظریں جھکا کر بولا: ”چکر صرف پیسے کا ہے۔۔۔ میرے جوان جوان بچے ہیں۔۔۔۔۔ تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ دو چار آدمیوں کی مختلف قسم کی خدمات انجام دینے پر مجھے چار پیسے مل جاتے ہیں۔“

”لیکن یہ خاتون کچھ ایسی مسکین قسم کی تو نہیں تھیں کہ انہیں چھپ چھپا کر چسکی لگانے کی ضرورت پیش آئے؟ طفر نے کچھ آگے کو تھکتے ہوئے کہا: ”بارہ چوبیس۔۔۔۔۔ کسی ہال میں بیٹھ کر بھی منگوا سکتی ہیں۔ ان کے سامنے انکار کی جرات کس کافر میں ہو گی؟“

”یہ بات نہیں ہے: تصدق حسین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”آج کل کافی سختی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر تم شاید اس عورت کو نہیں جانتے اس لیے اس کی پوزیشن کو نہیں سمجھتے۔ اس کے بارے میں اسکینڈل بننے کے امکانات کچھ زیادہ ہی ہیں۔ اس لیے وہ ہر معاملے میں محتاط رہتی ہے۔“

”کون ہے؟ اور کیوں پوزیشن نازک ہے اس کی؟“ طفر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”رئیسہ نام ہے اس کا۔۔۔۔۔ اور سیٹھ رفیق احمد کی بیوی ہے۔ کبھی نام سنا ہے سیٹھ رفیق احمد کا؟“ تصدق حسین نے پوچھا: ”سنا ہوا سا لگتا ہے۔“ طفر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا: ”شاید کہیں اخبار وغیرہ میں پڑھا ہے۔“

”ہاں۔ اخبارات میں عموماً اس کا ذکر چھپتا رہتا ہے اور کچھ عرصے پہلے تک تو بڑی کثرت سے چھپتا تھا: تصدق حسین نے اب قد سے پُرسکون ہو کر کہا: ”ٹیکسٹائل انڈسٹری کا بادشاہ ہے لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہے یا پھر رئیسہ کی کہ وہ عمر میں رئیسہ کے باپ کے برابر ہے۔ رئیسہ اس کی دوسری بیوی ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے اگر اس سے سیٹھ رفیق کی کوئی اولاد ہوتی تو شاید رئیسہ ہی کے برابر ہوتی۔۔۔۔۔ مگر اس سے بھی زیادہ بڑی ٹرے سیٹھی یہ ہوتی کہ دو تین سال قبل اس کی کار ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس حادثے میں اس کا زندہ بچ جانا اس کی خوش قسمتی تھی مگر میرے خیال میں تو یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کیونکہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کچھ ایسا نقصان پہنچا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپا بھوج ہو کر رہ گیا۔“

اس دوران ایک غیر ملکی سفید فام جوڑا سونگ پوڈ سے اٹھ کر کافی بار میں آ بیٹھا۔ شاز یہ فوراً اندر آ گئی۔

ایک بار پھر اپنی ہتھیلیوں کو گھومنے لگا۔

گلاس خالی کر کے شاز یہ اپنی سڈول اور گول کلائی پر بندھی ہوئی خوبصورت سی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے ظفر سے مخاطب ہوئی۔ تم کیوں ابھی تک یہاں منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔ تمہارا بال روم میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ جاؤ شاید آج کوئی قسمت کا مارا تمہاری ڈراؤنی آواز میں کوئی المیہ گیت سننا گوارا کر لے۔

لیکن پہلے دن تو تم نے میرا گیت سن کر کہا تھا: ہئے مسٹر ظفر! تمہاری آواز میں جادو ہے۔ بڑی جلدی رلے بدل لی تم نے۔ ظفر اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے مدھم سی آواز میں بولا۔

”جلدی کہاں؟“ شاز یہ گویا بڑا سناٹے ہوئے بولی۔

”یہ ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر کم تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک ماہ میں انسان کو اچھی خاصی عقل آجاتی ہے۔“

”اور ایک ماہ میں اچھا بھلا انسان پاگل بھی ہو جاتا ہے۔“ ظفر ٹھنڈی سانس لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔ کافی بار میں ان تینوں کے درمیان دبی دبی آواز میں روزانہ ہی اس طرح کی گپ شپ چلتی تھی اور وہ بڑے اچھے موڈ میں بال روم میں پہنچتا تھا۔ آج بھی موڈ تو اس کا اچھا ہی تھا لیکن وہ روز کی طرح اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ گڈ مڈ خیالوں کی جھیل میں بار بار ایک ہی چہرہ تیرنے لگتا تھا۔

وہی ماہتاب سا چہرہ، وہی آنکھوں میں نمی کی جھللاہٹ، یا تو قی ہونٹوں پر وہی خفیف سا کھنچاؤ۔ وہی رخساروں سے پھوٹتی تپش کا احساس۔ یہ سب کچھ جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا لیکن پھر اس نے بصد کوشش یہ سارے نقوش کو روحِ ذہن سے مٹا دیے۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ بلاوجہ کی خیال آرائی اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔ ساتھ ہی اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ آخر یہی چہرہ اس کے محسوسات میں کیوں اس طرح کھب کر رہ گیا تھا؟

اس ہوٹل میں اسے روزانہ ہی ایک سے ایک بڑھ کر شعلہ بردوش جسم، ایک سے ایک مقناطیسی چہرہ اور ایک سے ایک بڑھ کر ساحر شخصیت نظر آتی تھی۔ پھر اس پختہ العمر عورت میں کیا بات تھی؟ شاید اس کی تمکنت.... شاید اس کی مسکراہٹ کی نہتہ میں چھپی ہوئی یاسیت.... شاید دکھ کی پردے میں چھپی ہوئی اس کی محزونیت.... شاید اس کی ہنستی آنکھوں کی گہرائی سے جھانکتا ہوا ملال.... یا شاید بے عیب

مجھے کی طرح ترشا ہوا اس کا پیکر ظفر احمد کی ذلت میں سونے پہ کسی محروم و تشنہ کام انسان کو جگا گیا تھا۔

وہ بال روم میں آیا اور اسٹیج کے اس صفے پر بیٹھ گیا جو آرکسٹر کے لیے مخصوص تھا۔ سازندے اپنا ساز درست کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے سُر ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکاؤنٹ کا جوڑے بال روم میں موجود تھے اور شاید رقص کے لیے ایک دوسرے سے صلاح مشورے کر رہے تھے۔

باقاعدہ موسیقی شروع ہونے تک بال روم میں کئی جوڑے آگئے اور رقص شروع ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے تک وہاں جو دیوانی پھیلی ہوئی تھی، وہ ایک دیکھ بنگلے میں بدل گئی۔ ظفر کی نظریں متحرکتے جسموں پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ آج پہلی بار وہ اتنے پُر ہنگام ماحول میں اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اتنا تنہا اس نے اپنے آپ کو اس وقت بھی محسوس نہیں کیا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا اور نہ ہی اس وقت احساسِ تنہائی نے اس پر غلبہ پایا تھا جب باپ نے اسے عاق کیا تھا۔

دفعۃً اس کی روح میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ وہی حشر سامان بال روم میں آرہی تھی۔ سفید بالوں والے ایک شخص کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ وہ شخص ایک نفیس سوٹ میں تھا۔ اس کے بال سفید ضرور تھے مگر جسم میں جھکاؤ یا چہرے پر شکنیں نہیں تھیں۔ اس کی رنگت سرخ اور آنکھوں میں جوانوں کی سی چمک تھی۔ شاید وہ رئیسہ کے شوہر کا دوست نہ ہو۔

وہ ایک میز پر بیٹھنے لگے مگر پھر رئیسہ نے جھک کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور وہ بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے بعد وہ دونوں بھی رقص کرتے جوڑوں میں شامل ہو چکے تھے۔ رئیسہ کی آمد سے پہلے ظفر احمد مشینی انداز میں گٹار بجا رہا تھا۔ اسے دو تین مشرقی اور دو تین مغربی ساز بجانے آتے تھے لیکن عموماً اس کی ڈیوٹی صرف گٹار بجانے پر ہی لگتی تھی۔

رئیسہ کی آمد کے بعد اس کا گٹار بجانے کا انداز مشینی نہیں رہا تھا بلکہ جیسے اس میں اس کا خلوص اور دھڑکنیں شامل ہو گئی تھیں۔

رقص کا چلا راؤ بند ختم ہوا تو رئیسہ اور اس کا ساتھی ایک میز پر جا بیٹھے۔ ظفر اتنی دُور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ رئیسہ کی ستواں ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں شبنم کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔ تاہم آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کی دھندلاہٹ کچھ کم ہو چکی تھی اور اب اس کی آنکھیں بھی اس کی مسکراہٹ کا کچھ کچھ ساتھ لینے لگی تھیں۔

آپ کے ٹیلی ویژن کے
تحفظ کا ضامن

لارے

سیٹلائز

اپنے قیمتی ٹیلی ویژن کو برقی روکی
کمی بیشی سے محفوظ رکھنے اور
صاف تصویر کے لئے

ہیشہ

لارے

سیٹلائز استعمال کیجئے



بلیک اینڈ وائٹ

رنگین ٹیلی ویژن کیلئے ٹیلی ویژن کے لئے

ساختہ اٹلی

فاضل پُرزے باسانی دستیاب

علامہ محمد دوسل اینڈ کمپنی

پاراسٹریٹ آف زیب النساء اسٹریٹ صدر، کراچی

فون: ۵۱۰۶۶۶ - ۵۱۲۳۱۹

اس کے علاوہ آپ کے شہر کے تمام

ایکڑونک ڈیلروں کے پاس باسانی دستیاب ہے۔

GMD/81/2

انہوں نے اپنے لیے کوئلہ ڈرنک منگوائی اور بانوں کے
دوران دھیرے دھیرے چکیاں لینے لگے۔ اس دوران دوسرا
راؤنڈ شروع ہو چکا تھا مگر وہ رقص کے لیے نہیں اٹھے۔ دفعتاً
بیگم رئیسہ رفیق کی نظر اس بینر پر پڑی جس پر جلی حروف میں
مہمانوں کے فرمائشی نغمے سنانے کا اعلان تحریر تھا اور جس
میں اب ظفر احمد کا نام بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں
سکڑ گئیں اور کشادہ و روشن پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں
جیسے وہ اس اعلان پر غور کر رہی ہو۔ پھر اس نے اپنے ساتھی
کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے کچھ کہا اور اشارے سے
ویٹر کو بلایا۔

کچھ دیر بعد ظفر کے پاس ایک چٹ پہنچی جس پر انگریزی
میں لکھا تھا۔ اگر تمہیں ہیر آتی ہے تو سنا دو۔ بیگم رئیسہ رفیق؛
ہیر گانے میں تو ظفر احمد کو ملکہ محل تھا مگر آج تک
شہر میں شاذ و نادر ہی اس سے کسی نے ہیر سنانے کی فرمائش
کی تھی اور وہ بھی اس ماحول میں؟ اسے حیرت بھی ہوئی اور
فرط مسرت سے اس کے اعصاب پر ایک عجیب سی بھر پوری
طاری ہو گئی۔ یہ اشتیاق کا ریلہ تھا۔ وہ اس کے حضور آواز کا
نذرانہ پیش کرنے جا رہا تھا جس کے حسن و تمکنت اور جلال
آمینر خوبصورتی نے اسے پہلی نظر میں ہی مبہوت کر دیا تھا۔
دوسرا راؤنڈ ختم ہوا تو ظفر مائیک سنبھالے اسٹیج کے
وسط میں آیا۔ اس نے رئیسہ کی آنکھوں میں ہلکی سی شناسائی
کی لہر ابھرتے دیکھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو: اچھا.... تو تم وہی
ہو جو کافی بار میں بیٹھے تھے، گو یا اس کی نظر اتنی سطحی بھی نہیں
تھی جتنی بظاہر معلوم ہوتی تھی۔

ظفر احمد نے حتی الامکان مٹھرے مٹھرے اور پُر سکون
لہجے میں اعلان کیا کہ ایک معزز مہمان نے ہیر سنانے کی فرمائش
کی ہے اور وہ بصد مسرت یہ فرمائش پوری کرنے لگا ہے۔ اسٹیج
کی فاضل روشنیاں بجھ گئیں اور تیز روشنی کا صرف ایک دائرہ
ظفر پر مرکوز رہ گیا۔ ہال کی روشنیاں بھی مدہم پڑ گئیں۔

ظفر نے ہیر شروع کی تو اس کی آواز کچھ بہتر نہیں تھی لیکن
ایک آدھ منٹ میں ہی وہ سر میں آ گیا اور پھر ایسا سماں بندھا کہ
انگہ زیری دھنیں سننے والے سدھ بدھ بھول گئے اور ہال میں
ایسا سکوت چھا گیا گو یا کوئی وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ کوئی ایسی
آواز نہیں تھی جو موسیقی کی لے یا ظفر کی آواز میں خلل ڈالتی۔

ہیر گاتے وقت ظفر کو گو یا اپنا ہوش نہیں رہتا تھا۔ چند
لمحے بعد اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہیر کے منتخب حصے سنانے
کے بعد بند بچ اس کی آواز نیچی ہوتی گئی اور بالآخر وہ خاموش

ہو گیا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ وہ جیسے
فضائے بسیط میں لامحدود بلندی تک پرواز کر کے واپس
زمین پر آیا تھا۔

لوگ اس کے سامنے دھندلی روشنی میں اپنی اپنی نشستوں
پر بٹ بنے بیٹھے تھے۔ ظفر کے خاموش ہونے کے کئی سیکنڈ بعد
انہیں تالی بجانے کا ہوش آیا اور جب تالیاں بجنے شروع
ہوئیں تو یوں محسوس ہوا کہ اب کبھی نہیں تھیں گی۔ بہت دیر بعد
جا کر تالیوں کا شور تھا۔ زندگی میں پہلی بار ظفر کو اتنے خاص خاص
لوگوں کی محفل میں اتنی دار ملی تھی۔ اس کی آنکھیں خود بخود نم سی ہو
گئیں لیکن جس کے لیے اس نے گایا تھا، وہ بٹ بنی بیٹھی تھی اس
کی نظریں ایسٹج ہی کی طرف تھیں لیکن درحقیقت وہ نہ جانے کیا دیکھ
رہی تھی اور کس دنیا میں گم تھی۔

روشنیاں معمول پر آئیں تو رئیسہ قد سے چونکی مگر تالیاں
اس نے اب بھی نہیں بجائیں۔ بس ایسٹج سے اترتے ہوئے ظفر کی
طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ عجب مسرورگی میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ تھی۔
ظفر اپنی جگہ پر واپس جا بیٹھا۔

رقص کا تیسرا دور شروع ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ اس کے
ساتھ ہی ظفر کو ایک اور چٹ ملی۔ اس پر لکھا تھا۔ ”فاسغ ہو جاؤ
تو ہمارے ساتھ کچھ پینے کے لیے ذرا دیر کو آ بیٹھنا۔“ ظفر نے وہ
چٹ مٹھی میں بچھ لی۔ اس کے ہر سام جاں میں جیسے شبنم کی ٹھنک
سی اتر آئی۔

رقص کا چوتھا دور ختم ہوا تو ظفر فاسغ ہو گیا۔ وہ اپنے رگڑے
میں مچلتے اشتیاق کو چھپاتے، متانت کا لبادہ اوڑھے بیگم
رئیسہ رفیق کی میز پر پہنچا تو وہ پھیلی پر اپنے چہرے کا چاند ٹکائے
بیٹھی تھی۔ ظفر نے مؤدبانہ سلام کیا۔ اس نے سر کی خیف سی جنبش
اور بولتی آنکھوں سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے سامنے والی
کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس پر کچھ دیر پہلے تک اس کا سامنے بیٹھا
ہوا تھا۔

ظفر نے بیٹھنے سے قبل محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور
ملاحظت سے کہا ”آپ کے سامنے غالباً کہیں چلے گئے ہیں۔“
”ہاں۔۔۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کے پاس تفریح کے
لیے صرف ایک گھنٹہ تھا۔ بہت بڑا بزنس مین ہے۔۔۔ اور تیس
شاید علم ہو کہ کاروباری لوگوں کے پاس ہر کام کے لیے نپا تلا وقت
ہوتا ہے۔۔۔ ساڑھے گیارہ والی فلائیٹ سے اسے امریکا جانا ہے۔“
”اوہ۔۔۔“ ظفر نے صرف اتنا کہا اور مٹھلیں گدے والی کرسی پر
یوں بیٹھ گیا کہ یا ذرا سی بے احتیاطی سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ
جلنے کا اندیشہ ہو۔

”میرا نام رئیسہ رفیق ہے۔۔۔“ وہ بولی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ ظفر نے غیر ارادی طور پر کہا۔ پھر شرعیہ
سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا ”معروف اور حسین لوگوں کو
غائبانہ طور پر جان لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔“

”اس مشاقانہ تعریف کا شکریہ۔“ افسردگی میں لپٹی ہوئی
اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہو گئی۔ ظفر کے سامنے اس نے روم کے
جو دو بڑے مگ بھر کر پیے تھے، ان کے اثرات کا شائبہ ہو
اس کے لہجے میں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ صرف آنکھوں کے
گوشوں میں کچھ گلابی ڈسے جھلک رہے تھے، وہ بھی ضمیر کی ہیر
تھکن کی پیداوار معلوم ہوتے تھے۔

”میرا نام تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہو گا؟“ ظفر نے
ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں کہا۔ ہاں میں اب اکاؤنٹ کا جوڑا ہی
باقی رہ گیا تھا۔ موسیقی محض رسمی طور پر دھیمی دھیمی بچ رہی تھی۔
ظفر کو احساس تھا کہ کئی آنکھیں ان کی طرف متوجہ ہیں۔ جن میں
اس کے سامنے سازندوں کی آنکھیں بھی شامل تھیں۔

”نام نہ بھی معلوم ہوتا، تب بھی میں جلنے کی کوشش نہ کرتی۔“
رئیسہ رفیق کے لہجے کی کھنک نے اس کے دل میں گدگدی سی کی۔ ”میں
تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اتنا کرب، اتنا دکھ، اتنا سوز کہاں سے
سمیٹ لیا تم نے اپنی آواز میں؟“

”زمن نے ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے۔“ ظفر نے ان سمندر جیسی آنکھوں
میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اس وقت ان میں ایسا غضب کا
عطر اڑ تھا کہ اسے نظر چراتے ہی بن پڑی۔

”یہ کم عمری اور ایسا روگی لہجہ۔۔۔ اس لہجے کی تہ میں کوئی
کہانی بول رہی ہے۔“ رئیسہ نے دوسری پھیلی بھی پھوڑی تلے
ٹکالی۔ ”ہو سکے تو کل مجھے وہ کہانی سنانا۔ آج تو مجھ میں کوئی ایسی
دردناک بات سننے کا قطعاً حوصلہ نہیں۔“

”کہانی کچھ ایسی دردناک بھی نہیں ہے اور نہ ہی اتنی طویل ہے۔“
ظفر احمد نے ہونٹوں پر حتی الامکان زندہ دلانہ مسکراہٹ سجائے
رکھنے کی کوشش کی پھر اس نے گل چار پانچ جملوں میں اپنی داستان
حیات ختم کر دی۔

ظفر اپنی داستان حیات پر کسی تبصرے کا منتظر تھا کہ
رئیسہ نے اچانک جیسے مدہوشی سے چونک کر گھڑی دیکھی اور
قلبی غیر متوقع طور پر لٹکتے ہوئے بولی۔ ”اب میں چلتی ہوں اور نہ
میرے معذور اور بیمار شوہر کو شک کا سپہو لیا ڈسنے لگے گا۔“
چہرہ یک دم ہی دہلے چلی گئی اور گویا ماحول کا تمام رنگ
اور خوشبو سامنے لے گئی۔

ظفر نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو بے حد ہونٹ

عسوس کیا۔ اس نے کھیلا ہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر دوبارہ کافی بار میں آ گیا۔ جہاں اب خالصے گا ہک نظر آ رہے تھے۔ شازیہ اور تقدق حسین دونوں بے حد مصروف تھے۔ بیشتر گا ہک رخصت ہوئے اور شازیہ فالسغ ہوئی تو وہ ظفر کے قریب ہی اسٹول پر آ بیٹھی۔ ظفر نے عسوس کیا کہ اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

”کیا بات ہے؟ یہ پھولا ہوا منہ مزید کیوں پھولا ہوا ہے؟“ ظفر نے اسے چھیڑا۔ ”کام زیادہ کرنا پڑ گیا کیا؟“

”مسئلہ کام کا نہیں ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”عورت کے ساتھ ہر جگہ ہی نا انصافی ہوتی ہے۔ اب دیکھو، ہم لوگوں کی شفٹ رات کو دو بجے ختم ہوتی ہے۔ ہمیں اور دیگر لوگوں کو جو تقریباً سبھی مرد ہوتے ہیں۔ ہوٹل کی گاڑی گھر چھوڑنے جاتی ہے اور مجھے لڑکی ہونے کے باوجود رکشے میں جانا پڑتا ہے۔ ٹرانسپورٹ مینجر کا کہنا ہے کہ میرے گھر کی طرف اور لپٹنے میں چونکہ کوئی اور ملازم نہیں رہتا، اس لیے مجھ اکیلی کو چھوڑنے کے لیے ہوٹل کی دیگن نہیں جاسکتی۔ حالانکہ مجھے تنگ کیے جانے کی وجہ دوسری ہے۔ جسے تم بھی بخوبی سمجھتے ہو اور وہ یہ کہ ٹرانسپورٹ مینجر مجھ سے خوش نہیں ہے۔۔۔۔ اور اسے خوش رکھنا میرے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے اس کی مکر وہ صورت سے سخت نفرت ہے۔“

”تو تمہارا جھگڑا ہو گیا اس سے؟“ ظفر نے پوچھا۔ ”ہاں۔ آج حالانکہ میں نے انکساری سے بات کی تھی لیکن وہ حسبِ عادت فرعون بنا رہا۔ شازیہ غضب آلود لہجے میں بولی ”ایک تو اپنی قوم میں ایک یہ بڑی مکروہ عادت ہے کہ ذرا سا کسی کو اختیار ملا اور وہ فوراً دُم پر کھڑا ہو گیا، یکدم فرعون بن گیا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا کیونکہ میں رات ہی سے سگ لے ہی تھی۔ ایک تورات کے دیبے نیو کر اچی جانے کے لیے رکشا تلاش کرنا ہی کارڈا ہو جاتا ہے۔ اوپر سے رات مرے پر سو درے والی بات یہ ہوتی کہ ہمیں کافی بار سے اٹھنے والے دوڑ پونچھے قسم کے بے فکرے سے نوجوان موٹر سائیکل پر میرے پیچھے لگ گئے۔ راستے بھراٹوں نے بہت تنگ کیا ہے چارورکشے والا بوڑھا اور شریف آدمی تھا۔ اس نے نہ جانے کتنی مصیبتوں سے مجھے گھر پہنچایا اور راستے بھر حوصلہ دیتا رہا۔ آج میں پر سنل مینجر سے بات کر دوں گی۔“

”جب تک تمہارا جھگڑا طے نہیں ہو جاتا تب تک میں تمہیں چھوڑ آیا کروں گا۔ ظفر نے خلوص سے کہا۔ اور اسی رکشے میں واپس آ جایا کروں گا۔ میں تو ہوٹل سے قریب ہی رہتا ہوں۔“

”اور اگر راستے میں گشتی سپاہیوں نے روک کر ہم پر سوجھا فحش حرکات کرنے کی دفعہ عائد کر دی تو؟“ شازیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس کا موڈ اب خوشگوار ہو چکا تھا۔

”تم کہہ دینا ہم میاں بیوی ہیں۔“ ظفر نے شرارت سے کہا۔ ”اس میں دو قبا حیتیں ہیں۔“ شازیہ چہرہ سنجیدہ بناتے ہوئے بولی، ”پہلی بات تو یہ کہ پولیس والے عموماً اس دعوے کے جواب میں مزید خوشنود لہجے میں کہتے ہیں۔ ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ پہلے سب یہی کہتے ہیں لیکن تمہانے چل کر سچے بولنے لگتے ہیں۔“ دوسری بات یہ کہ تمہارے منہ سے تو یہ دعویٰ اور بھی ناموزوں لگے گا۔ تم تو موت سے ہی شادی شدہ نہیں لگتے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی چھڑے ملنگ ہو۔ ابھی تمہاری شکل پر شادی شدہ لوگوں والی مسکینی پیدا نہیں ہوئی۔“

”تمہیں تو ہر معاملے میں بہت ہی تجربہ حاصل ہے؟“ ظفر نے قدے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”دس سال ہو گئے ہیں گھر سے باہر دھکے کھاتے ہوئے۔“ وہ پُر خیال انداز میں کاڈنٹر کو گھومتے ہوئے مسکرائی۔ اور نوکری بھی ہمیشہ ایسی ہی ملی ہے جس میں مردوں کا بھی پتہ پانی ہو جائے۔“ پھر جیسے اس کی ذات میں چھپا ہوا کوئی درد ابھرا آیا اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے سرسراہٹ ہوئی سی آواز میں سرگوشی کی۔ ”میں تمہیں دوست سمجھتے ہوئے ایک راز کی بات بتاؤں ظفر۔۔۔۔ کہ میں تمہیں اپنے ساتھ گھر نہیں لے جاسکتی۔ کیونکہ میں اپنی ماں کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کے سائے نمودار ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“

”خوف اور دہشت کے سائے؟“ ظفر نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، ”کیا میری صورت بہت ڈراؤنی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ تمہارے خوش شکل ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ شازیہ جیسے بے چین ہو کر بولی۔ اور تمہاری اصل خوبصورتی تمہاری یہ معصومیت ہے جو آج کل کے نوجوانوں کے چہروں پر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔۔۔۔۔ لیکن جو بات میں کہنا چاہتی ہوں اسے شاید تم سمجھ نہ پاؤ۔۔۔۔۔ تاہم میں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے مضطربانہ سے انداز میں تھوک نگلا۔ پھر سامنے رکھے ہوئے گلاس میں سے ایک گھونٹ بھر کر بولی، ”میرے ساتھ جب بھی کسی اتفاق کے تحت کسی بھی شخص کو۔۔۔۔“

میرے گھر تک جانا پڑتا ہے، میری ماں دہشت زدہ اور گم صہم سی ہو جاتی ہے۔ میں اس کے محسوسات کو سمجھتی ہوں۔ اسے یقیناً اندیشہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب میری اس سے راہ و رسم بڑھے

لی جو بالآخر شادی پر منتج ہوگی۔

”تو اس میں دہشت زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟“ ظفر نے پہلے سے زیادہ حیرت سے کہا۔ ”ہر ماں باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ بیٹی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔“

”دست ہے..... لیکن تم سمجھنے کی کوشش کرو ظفر! میرا باپ مرچکا ہے، ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں، میرے پانچ چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ بھائی تو بالکل ہی چھوٹے ہیں۔ گھر بڑا ذمہ داری میں کسی طرح بھی ہنڈ بٹانے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ بہنیں بھی کم سن اور مصمم سی ہیں۔ بالکل چھوٹی موٹی سی۔ ایک میں ہی ہوں نہیں پر گھر کا دار و مدار ہے اور تو اس دنیا کے جنگل میں بے خوف و خطر نکل سکتی ہے۔ ذرا سوچو۔ اگر میں شادی کر کے میاں کے گھر سدھار جاؤں تو میرے گھر کا کیا بنے گا؟ مہوکی تنگ دستی اور بے سہارا پن بہت خوفناک چیز ہے ظفر! میں اپنی ماں کے خوف کو بجا سمجھتی ہوں۔“ وہ ظفر کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر مجروح سے انداز میں مسکرائی اور سر جھکا لیا۔

مسئلہ بہت نازک، الجھا ہوا اور درد آمیز تھا۔ ظفر اس پر مزید اظہار خیال کے لیے محتاط الفاظ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اس گوشش میں مصروف ہی تھا کہ کافی بار میں کچھ گاہک آگئے اور شازیرہ ان کی خدمت گزاری کے لیے ان کی میز پر جا پہنچی۔

ظفر کا دل بو جھل ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس وقت میں ہر چہرے ہی کے پیچھے ایک الجھی ہوئی کمائی پوشیدہ ہے، ہر قسم کی کھنک کے پیچھے آنسوؤں کی چمک ہے، ہر سینہ فگار ہے اور ہر دل زخمی۔ کس کس کے زخم پر مرہم رکھیے اور کس کس کی دلجوئی کیجیے اور کسے اپنا سینہ کھول کر دکھائیے۔ اپنی بو جھل سوچوں میں الجھا ہوا وہ ہوٹل کی عمارت سے نکل کر کمپاؤنڈ کے اس حصے میں آ بیٹھا جہاں خوبصورتی کی غرض سے ایک فوارہ بنا ہوا تھا۔ فضا میں اچھلتا ہوا اس کا پانی روشنیوں کی مدد سے ست رنگا نظر آتا تھا اور یہ رنگ گردش کرتے رہتے تھے۔ دنیا بھی اس کے خیال میں اس فوارے ہی کی طرح ست رنگی تھی اور ہر پل اس کے رنگوں کے زاویے بدلتے رہتے تھے اور کوئی بھی رنگ اصلی نہیں تھا، محض روشنیوں کی پیداوار تھا۔

کسی بھی رنگ کو ثبات حاصل نہیں تھا۔ کبھی خوشی کا رنگ تو کبھی دکھ کا رنگ۔ ایک پل میں ہنسی کا رنگ تو دوسرے پل میں آنسو اور یاسیت کا رنگ۔ چند لمحوں پہلے تک رئیسہ رفیق سے تعارف حاصل ہو جانے کے خیال سے اس کے دل میں گدگدی سی ہورہی تھی تو اس کے کچھ ہی دیر بعد شازیرہ کی باتوں نے اسے اداس کر دیا تھا لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ

دونوں ہی جذبے اس کے لیے بے معنی اور بے سود تھے۔ بیگم رئیسہ رفیق سے اگر اسے تعارف حاصل ہو گیا تھا تو اس میں خوشی سے اچھلنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کی رسائی سے بہت اونچی چیز تھی اور شادی شدہ تھی۔ آج تو اس نے ظفر کو اپنی میز پر بلایا تھا، کل کو شاید اسے یاد بھی نہ رہتا کہ ظفر ہے کون؟ اس کمائی کو کوئی انجام نہیں مل سکتا تھا اس لیے اس پر مسرور ہونا محض شیخ چلی کے نقش قدم پر چلنے والی بات تھی۔ باقی رہا شازیرہ کا سوال۔ تو اس کے لیے بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ شازیرہ نے خود ہی اس امکان کو مسترد کر دیا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی نجی زندگی کی حدود سے نکال باہر کر دیا تھا۔ تو گویا اس کے پاس نہ تو خوش ہونے کی کوئی معقول وجہ موجود تھی اور نہ ہی اداس ہونے کی۔ کیسی خالی خالی بوجھ اور بے جواز سی زندگی تھی۔

.... لیکن اس سے اگلی رات اس کی زندگی میں خوشی و مسرت کا پلہ پھر بھاری ہو گیا۔ وہ یوں کہ بیگم رئیسہ رفیق نے اس رات اسے پھر اپنی میز پر بلایا اور گفتگو کا آغاز ایک بار پھر اسی جملے سے کیا۔ ”اس عمر میں اتنا درد کہاں سے سمیٹ لیا ہے تم نے اپنی آواز میں؟“

اس کے لہجے میں آج بھی خمار کا بو جھل بن تھا۔ ظفر دیکھو چکا تھا کہ آج بھی وہ کافی بار میں بیٹھ کر بلیک کافی کی آرٹس ریم کے دو رنگ پی کر آئی تھی۔ ظفر نے اپنی زندگی میں یہ پہلی عورت دیکھی تھی جو خالص ریم پیتی تھی اور وہ بھی اچھی خاصی منفرد اس۔ ورنہ اس کے تجربے کے مطابق تو عورتیں بہت ہی آرٹسٹک تو تھوڑی سی بہت بیٹری لیتی تھیں۔ زندگی میں اکا دکا عورتوں کو اس نے دھکی پٹتے بھی دیکھا تھا مگر دو چار گھونٹ کی حد تک۔

دوبارہ ایک ہی سوال سے گفتگو کا آغاز کرتے وقت بیگم رئیسہ رفیق کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی ظفر سے مل چکی ہے لیکن ظفر نے جب وہی جواب دیا جو وہ کل دے چکا تھا تو بیگم رئیسہ رفیق نے معترفانہ سے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ جواب تو تم کل بھی دے چکے ہو۔ آج تمہیں کوئی نیا جواب سوچنا چاہیے تھا....“ پھر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے رخساروں پر شفقت کی سرخی جھلک آئی۔ ”تم سمجھ رہے ہو گے کہ میری یادداشت کمزور ہے؟“

ظفر کہتا چاہتا تھا کہ نشے میں انسان کی یادداشت کسی حد تک تو متاثر ہوتی ہے لیکن فوراً ہی اس نے یہ الفاظ ہونٹوں

میں ہی دبائے۔ بیگم رئیسہ رفیق نے نوشی کے اپنے طوبی کار کو ایک راز سمجھتی تھی۔ اس خوش فہمی کا طاسم ٹوٹ جانے پر اس کا رد عمل نہ جانے کیا ہوتا۔

وہ خاموش رہا اور اس حسنِ رُشکوہ کے جلوے نگاہوں میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔ آج رئیسہ سیاہ ساری میں تھی۔ گویا ایک چاند تھا جو تاریکی کے پردوں میں مقید تھا مگر چاندنی تھی کہ کہیں نہ کہیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ آج اس نے بال روم میں موجودگی کے دوران رقص وغیرہ کے اہتمام پر ظفر کو فرمائش بھیجی تھی کہ وہ کوئی پاکستانی اور فلمی گانا سنائے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا تھا: ”فرمائش بے شک چپ معلوم ہوتی ہے لیکن گانا چپ نہیں ہونا چاہیے۔“

ظفر نے چند لمحے غور کرنے کے بعد یہ نغمہ سنایا تھا۔

تم ضد تو کر رہے ہو ہم کیا تمہیں سنائیں

نغمے جو کھو گئے ہیں انکو کہاں سے لائیں

ظفر نے محسوس کیا تھا کہ نغمے کے دوران رئیسہ نے رومال سے آنکھیں پونچھی تھیں یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنی ہی آواز کے مد و جز میں مہوش تھا۔ چند لمحے بعد رئیسہ نے اس کے گانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ نغمہ میں نے پہلے بھی سنا ہے۔ غالباً مہدی حسن کی آواز میں تھا اور مہدی حسن یقیناً تم سے بہتر گلوکار ہے لیکن اس وقت میری جو کیفیت ہوئی ہے وہ اس وقت نہیں ہوتی تھی۔ گانے والا سامنے موجود ہو تو شاید کچھ اور ہی بات ہوتی ہے یا پھر شاید یہ وقت وقت کی بات ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کیفیات اور محسوسات سب تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ لڑکپن اور نوجوانی میں جو گیت اچھے لگتے ہیں وہ میری عمر میں اگر بچکانہ محسوس ہونے لگتے ہیں اور اپنی کشش کھو بیٹھتے ہیں اور جو گیت بچپن اور لڑکپن میں اچھے نہیں لگتے سمجھ میں نہیں آتے ذرا بچی عمر میں اگر ان میں ایسی دلکشی اور معنویت پیدا ہو جاتی ہے کہ دل تڑپ اٹھتا ہے۔ کچھ نغمے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اور ہر عمر میں ہی دل کو اپیل کرتے ہیں، کچھ نغمے ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنے جھوٹے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے بعض اوقات ناک بھوں چڑھا کر سنتے ہیں لیکن جب ہم اپنے مصنوعی خول سے باہر آکر خلوص دل سے سنتے ہیں تو ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور بظاہر سیدھے سادے، سلی اور معمولی سے الفاظ ہمارے گنجلک دکھوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔“

ظفر احمد دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ

بھی نہیں سکتا تھا کہ زیادہ تر انگریزی دھنوں پر بھرنے والی، ایک سرمایہ دار عورت اردو نغموں اور گیتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے اظہارِ خیال کر سکتی ہے۔

رئیسہ نے اسے گم مضم دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے مجھے اب نغموں اور گیتوں کے موضوع پر اپنی تقریر بند کر دینی چاہیے۔ اور سناؤ کیا حال چال ہے؟“

ابھی ظفر کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ رئیسہ کو جیسے کوئی خیال آگیا، چونک کر بولی۔ ”تمہیں کبھی ریڈیو، ٹی وی یا فلم میں گلے کا چانس نہیں ملا؟ اتنی خوبصورت آواز ہے تمہاری۔“

”کبھی صحیح طور پر کوشش نہیں کی۔ ظفر نے آہستگی سے کہا۔ ”کبھی کسی سے واقفیت نہیں نکلی۔ اور یہ تو آپ کو معلوم

ہی ہو گا کہ بغیر واقفیت وغیرہ کے تو ریسپشن سے آگے نکلنا بھی محال ہے۔۔۔ البتہ دو سال پہلے ریڈیو کے لیے آڈیشن دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ نتیجہ آپ کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا جائے گا۔ آج

تک تو موصول نہیں ہوا۔“

”کیا خیال ہے اگر اگلے ہفتے ٹی وی سے تمہارا نغمہ نشر ہو تو

کیسا رہے؟“ بیگم رئیسہ رفیق نے قدرے آگے جھک کر سرسری

سے لمحے میں پوچھا۔

ظفر ایک لمحے کے لیے تو کچھ بھی نہ بول سکا پھر دھیرے

سے ہنس کر بولا۔ ”کیوں مذاق کرتی ہیں آپ؟“

”میں شناسائی کے کم از کم اتنے ابتدائی دور میں مذاق کرنے

کی عادی نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر

ٹکاتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے اپنا ایڈریس اور کوئی ایسا فون نمبر

دے دو جس پر تم سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہو۔“

ظفر نے اس ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا اور

ویٹر کو بلا کر اس سے قلم اور کاغذ منگو کر رئیسہ کو اپنا پتہ اور رابطے

کا فون نمبر لکھ دیا۔ گو کہ اسے یہ سب کچھ محض ایک طفلِ تسلی ہی

محسوس ہو رہی تھی۔

دوسرے روز وہ اپنے کمرے میں ابھی بستر میں ہی دبکا

ہوا تھا کہ اوپر کی منزل سے اس کی مکان مالکن نے کرخ آواہ

میں پکارتے ہوئے اسے اطلاع دی کہ اس کا فون آیا ہے۔

دس بج چکے تھے اور ظفر خاصی دیر سے جاگا ہوا بھی تھا لیکن

عادتاً وہ گیارہ بجے سے پہلے بستر سے نہیں نکلتا تھا۔ فون کا

سن کر وہ تیزی سے بستر سے نکلا اور سلیپر گھسیٹا اور پر کی طرف دوڑا۔

فون ٹی وی سینٹر سے تھا اور ایک اسسٹنٹ پروڈیو

نے اسے اطلاع دی تھی کہ ایک بجے اس کا آڈیشن ہے۔ یہ اس

کی زندگی کی پہلی ایسی غیر متوقع خبر تھی جسے سننے کے بعد اس

کا خوشی سے رقص کرنے کو جی چاہ رہا تھا اور اس خواہش پر ضبط کرتے ہوئے اس کے جسم میں حیوٹیاں سے ریگنے لگی تھیں۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا: خوش فہمی کے راستے پر اتنا آگے بڑھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ محض آڈیشن کا بلادہ سن کر ہی سنہری مستقبل کے خواب دیکھنے لگو۔ آڈیشن تو سال میں ہزاروں لوگوں کا ہوتا ہے مگر جانس کتنوں کو ملتا ہے؟ اس کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا تو وہ باہر نکلنے کے لیے تیار ہونے لگا۔

اس روز ٹھیک ایک بجے وہ ٹی وی... اسٹوڈیو میں موجود تھا۔ موسیقی کے پروگراموں کے پروڈیوسر نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ بس باچھیں پھیلا کر اس سے ملتا تھا اسے بعد اصرار چائے پلائی تھی اور ایک فارم بھروانے کے بعد اسے اسٹوڈیو میں بھیج دیا تھا۔

صرف آدھے گھنٹے میں اس کا آڈیشن مکمل ہو گیا حالانکہ ریڈیو کے لیے جب بعد کوشش اس کا نام آڈیشن کے لیے منظور ہوا تھا تو اسے دیگر بچا سول امیدواروں کے ساتھ گھنٹوں لابی میں کھڑے رہنا پڑا تھا۔

آڈیشن کے بعد پروڈیوسر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا: ”رسمی طور پر نتیجہ جاننے کے لیے آپ کو کل آنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ ساتھ ہی ہم آپ کو ریسرسل کا وقت بھی بتا دیں گے۔ ہمارا وہ جو نوجوان گلوکاروں کا پروگرام ہوتا ہے نا، جو اسے ترنگ... پہلے ہم اس میں آپ کا ایک نغمہ ریکارڈ کریں گے۔ وہ پروگرام آئندہ بدھ کو ٹیلی کاسٹ ہوگا۔ اس کے بعد ہم آپ کو دوسرے پروگرام دیں گے۔ تاکہ محسوس ہو کہ آپ زینہ بزمینہ آگے بڑھ رہے ہیں۔“

اس روز ظفر دوسرا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں واپس آیا تب بھی اسے بار بار یہی وہم ہو رہا تھا کہ وہ ایک حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسے لوگ جن کامیابیوں کے لیے برسوں تک ورد کرتے رہتے ہیں وہ کسی کے ایک اشارے سے جھولی میں آگرتی ہیں۔ اس امر کا تو اسے اندازہ ہی نہیں تھا، اس پہلو پر تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی کو سنتے سنا تھا کہ ہر بڑی کامیابی کی تہہ میں ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس نے اس کہاوت کا مفہوم ہی یا تھا کہ عورت کے ہاتھوں اچھی تربیت پاکر ہی انسان بڑی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ اس کہاوت کے ایک نئے پہلو ایک نئے رخ سے روشناس ہوا تھا۔ گویا بات یوں بھی بن

سکتی ہے۔ اس نے سوچا۔

پھر اسے وہ اڑتی اڑتی سی باتیں یاد آ گئیں.... وہ قہقہے... وہ افسانے.... وہ سچی اور نیم سچی باتیں کہ کس طرح لوگ عورتیں پیش کر کے بڑی بڑی بازیاں جیت لیتے ہیں۔ ادھر کی دنیا ادھر کر دیتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے ظفر کو محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ وہ تو اس پوزیشن میں ہی نہیں تھا کہ کسی عورت کو کہیں پیش کر سکے۔ درحقیقت عورت نے اسے پیش کیا تھا اور اس کے لیے بھی اس نے عورت سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ اس عورت پر اس کا کوئی اثر رسوخ بھی نہیں تھا۔ اس نے خود ہی ترنگ میں آکر اس کی مدد کا ارادہ کیا تھا۔

یہ سب کچھ سوچ کر وہ قدرے مطمئن ہو کر لیٹ گیا۔ اس کے اعصاب پر عجیب سا ہیجان طاری تھا جو کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیگم رئیسہ رفیق کا شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں ترین الفاظ جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

.... لیکن اس شام وہ ہوٹل پہنچا تو رات گئے تک اس کی نگاہیں بے چینی سے انتظار ہی کرتی رہیں مگر بیگم رئیسہ رفیق اسے کہیں نظر نہ آئی۔ شکر گزاری کے وہ تمام الفاظ جو بڑی مغز ماری کے بعد ظفر نے منتخب کیے تھے انہیں وہ مغز ہی میں چھپائے ادھر ادھر گھومتا رہا۔

دوسرے روز وہ مقررہ وقت پر ٹی وی سینٹر پہنچا تو اسے نوید ملی کہ وہ آڈیشن میں کامیاب ہو گیا ہے۔ پروڈیوسر نے اسے اسی وقت ایک منتخب نغمہ دے کر ریسرسل کے لیے ساندزوں کے پاس بھیج دیا۔

اس شام بھی رئیسہ ہوٹل میں نہیں آئی۔ اس سے اگلے روز ظفر کا نغمہ نوآموز گلوکاروں کے پروگرام میں ریکارڈ ہو گیا۔ بدھ کو یہ پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا تھا اور بدھ تک رئیسہ رفیق ہوٹل میں نظر نہیں آئی۔ ظفر کو اس کے یوں غائب ہو جانے پر ایک عجیب سا اضطراب بھی تھا اور ایک طرح کا ملال بھی۔ آخر وہ کیوں نہیں آ رہی تھی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

بدھ کی شام کو وہ ہوٹل میں موجود تھا اور علیے میں جن سے بھی اس کی شناسائی تھی ان سب کو بتا چکا تھا کہ آٹھ بجے اس کا نغمہ نشر ہوگا۔ ان میں سے جو کاموں میں مصروف تھے وہ کام سے جان چھڑانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور جنہیں کام کرنے کی جگہ پر ٹی وی میسر تھا وہ کام کے دوران بھی اسی کی طرف متوجہ تھے۔

ظفر خود لاؤنج میں موجود تھا جہاں چاروں گوشوں میں

پر قہقہہ شفا کی ایک غزل سن رہا تھا۔ جس وقت رئیسہ رفیق نے بال روم میں قدم رکھا، ظفر غزل کے اس شعر پر بھاگ نکلا۔

تیرے غم میں بہہ گیا ہے مرا ایک ایک آنسو
نہیں اب کوئی ستارہ جو چمک سکے تنگ میں

یہ شعر ایک لمحے کے لیے تو گویا رئیسہ کے قدموں میں زنجیر بن گیا اور وہ میز کی طرف بڑھتے بڑھتے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئی۔ اتنے دن بعد اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں ظفر کی آوازیں بھی لرزش سی آگئی۔ پھر دونوں اپنی اپنی جگہ سنبھل گئے۔ ظفر نے غزل جاری رکھی اور رئیسہ ایک میز پر آ بیٹھی۔ ہال میں سکوت طاری تھا جس میں صرف ظفر کی آواز اور چند سازوں کا مدوجزر جادو جگ رہا تھا۔ ہال میں کم ہی افراد موجود تھے مگر وہ سب ہمہ تن گوش تھے۔

غزل ختم ہوئی تو ظفر کو رئیسہ رفیق کی فرمائش موصول ہوئی ٹی وی پر تمہارا جو نغمہ چلا ہے وہی سنا دو، ظفر نے وہ نغمہ سنایا اور اپنی دانست میں ٹی وی سے بہتر طور پر گایا۔

ہال سے تقریباً تمام لوگ رخصت ہو چکے اور آرکسٹرا بھی فارغ سا ہو کر بیٹھ گیا تو ظفر رئیسہ کی میز پر پہنچا جو اسے فوراً ہی اپنے ساتھ ریستوران میں لے آئی۔ وہ ایک میز پر بیٹھ چکے تو ظفر نے پوچھا۔ ”آپ اتنے دن نظر کیوں نہیں آئیں؟“
”کیا تم نے میری کمی محسوس کی؟“ رئیسہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ظفر نے ایک لمحے تامل کیا جیسے وہ اپنے دل کو ٹٹول رہا ہو پھر وہ مدھم سے لمحے میں بولا۔ ”بہت زیادہ۔“

رئیسہ رفیق کے چہرے پر جیسے طمانیت سی چھیل گئی۔ اس کی نم آلود سی آنکھوں میں پہلی بار مسرت کی ہلکی سی جھلک اُبھڑی بھی نظر آئی۔ اس نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالی اور اس کی صراحی دار گردن کچھ اور حسین لگنے لگی۔ وہ آج فیروز رنگ کا ایک عجیب سے چمکیلے کپڑے کا حیدر آبادی قمیص اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ آج کل اونچے طبقے کی بیگمات میں چاندی کے زیورات کا فیشن چلا ہوا تھا۔

وہ بھی چاندی کے پازیب اور چمپا کلی پہنے ہوئے تھی۔ موتیوں کی لڑیوں کی مدد سے بالوں کا خجڑا شاہی تاج کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ وہ ہر روز ہی گورے ہوئے دن سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی۔

”دراصل میں نے سوچا کہ میں اس وقت ہی تمہارے سامنے جاؤں گی جب تم سے کیا ہوا وعدہ پورا ہو جائے گا۔“ وہ دھیرے

چار رنگین ٹی وی موجود تھے۔ لاؤنج میں چند ایک ملکی اور غیر ملکی افراد موجود تھے جو نہایت بے دلی اور نیم تو جہی سے کبھی کبھی ٹی وی کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

’جواں ترنگ‘ پروگرام شروع ہوا اور ایک گلوکار اور ایک گلوکارہ کا نغمہ ختم ہونے کے بعد جب کمپیئر نے ظفر احمد کا نام لیا تو اس کی دھڑکن بے حد تیز ہو گئی اور رگ و پے میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگیں۔ کمپیئر نے اس کا تعارف نہایت ہی خوبصورت اور بہت افزا انداز میں کرایا تھا۔ پھر اس کا نغمہ شروع ہوا۔

ویسے تو نغمے کی ریکارڈنگ کے دوران بھی ظفر اپنے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر نصب ایک ٹی وی سیٹ (مانیٹر) پر اپنے آپ کو دیکھتا رہا تھا لیکن اب ایڈیٹنگ کے بعد تو اس کی حرکات و سکنات اور شخصیت میں کچھ اور ہی نکھار آ گیا تھا۔ خود پرستی سے قطع نظر اسے محسوس ہوا کہ اس کی شخصیت خاصی جاذب نظر ہے۔ شو بزنس میں، گلیمر کی دنیا میں وہ اجنبی اور اُن فٹ نہیں لگتا تھا۔

اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آواز یا شخصیت نے لاؤنج میں موجود چند لوگوں کو ٹی وی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاؤنج میں روشنی بہت کم تھی ورنہ شاید کوئی اسے دیکھ کر پہچان بھی لیتا کہ ٹی وی پر اس وقت اسی کا نغمہ چل رہا ہے۔ اس احساس سے اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ ایک نوا موزخ نیکار کے دل میں یہ خواہش کتنی شدت سے موجود ہوتی ہے کہ لوگ اسے پہچانیں۔

نغمہ ختم ہونے کے بعد وہ ہوٹل کے جس حصے میں بھی گیا، محلے کے لوگوں نے نہایت گرجوشتی سے اسے مبارکباد دی۔ حتیٰ کہ پرسنل مینیجر نے بھی اسے اپنے دفتر میں بلوایا اور کہا۔ ”دیکھا تم نے ہمارے ہوٹل میں کام کرنے کا فائدہ؟ ایک شاندار استقبال تمہارا منتظر ہے۔۔۔ اب تو شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس شہر کے بڑے بڑے اہم انقلابات کی بنیاد ہمارے ہی ہوٹل کی میزوں پر پڑتی ہے لیکن جب تم مشہور گلوکار بن جاؤ تو ہوٹل کی ملازمت چھوڑ کر مت چلے جانا۔ بہت سے فائدوں سے محروم ہو جاؤ گے۔“

”میرا یہاں دل لگ گیا ہے۔“ ظفر بولا۔ ”میرا اب یہاں سے جانے کا تصور کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔“ وہ دفتر سے باہر آ گیا۔

اگلی رات رئیسہ رفیق اسے بال روم میں نظر آئی۔ رقص کے دور ختم ہو چکے تھے اور اس وقت ظفر ایک مہمان کی فرمائش

سے مسکرائی۔ ”میں نے کہا تھا تاکہ ایک ہفتے بعد ٹی وی سے تمہارا نغمہ نشر ہوگا۔ جس طرح کاروبار میں پہلا ملین کمانا مشکل ہوتا ہے اور اس کے بعد گویا گاڑی خود بخود ہی لوڑھکنے لگتی ہے اس طرح شو بزنس کی دنیا میں بھی پہلا قدم رکھنا ہی دشوار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر انسان کے پاس فن ہو تو وہ خود بخود ہی اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔ تمہارے فن میں جان ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا مستقبل نہایت روشن ہے۔ جلد ہی تم ٹی وی کے اسٹار سنگڑ ہو جاؤ گے۔ ورائٹی پروگراموں میں تمہیں بک کرنے کے لیے رسہ کشی مہیا کرے گی اور نہایت اونچے طبقے کی تقریبات میں تمہیں بلانا باعث فخر سمجھا جائے گا“



رئیسہ رفیق کی پیشگوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور اس میں زیادہ عرصہ بھی نہیں لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہرہ کی کاغذیں ملک بھر کا کرز بن گیا۔ نئی نسل کو اس نے ڈسکو ڈانس اور نغموں سے پاگل کر دیا تو پرانی نسل کو لوک گیتوں سے اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ اس قدر مصروف ہو گئی تھا کہ ٹی وی کے لیے بھی بہت کم وقت نکال پاتا تھا جس کی بدولت اسے اتنی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اب کلفٹن کے علاقے میں ایک چھوٹے سے خوبصورت اپارٹمنٹ میں رہتا تھا جس کی خواہگاہ میں سمندر کی حک ہوائیں ہمار کاوٹ کھڑکی کے راستے آتی تھیں اور اس کے بالوں اور رخساروں سے اٹھکیاں کر کے اسے جگاتی تھیں۔ اس نے ایک چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ کنورٹبل گاڑی بھی لی تھی جس کا ٹاپ وہ عموماً ڈاؤن ہی رکھتا تھا، یوں راہ جاتے لوگ اسے پہچان لیتے تھے اور بلاوجہ ہی پراستیا کی انداز میں ایک دوسرے کو کہنیاں مارا کرتے تھے۔ ”وہ دیکھو... ظفر احمد جا رہے...“ کچھ لوگ نہایت بے ہودہ اور غیر مہذبانہ طریقے سے اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کچھ اسے کہیں موجود پاکر نہایت شائستگی سے ٹوگراف کی درخواست کرتے تھے۔ بچے اور لڑکیاں تو خصوصاً اس کی دیوانی تھیں۔

اتنی محبت۔ اتنی شہرت۔ اتنی عزت۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی اس کے شکستہ دامن میں اتنا کچھ ہوگا۔ قدرت اس کی جھولی کو اس فیاضی سے بھر دے گی۔ رات کو وہ اپنے آرام دہ بستر پر سوتے سوتے اب بھی کبھی کبھی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تھا اور پہلا خیال اسے یہی آتا تھا کہ شاید یہ ہنگامہ خیز سپنا ٹوٹ گیا لیکن پھر وہ اپنا سجا سجا یا کمرہ، ایک گوشے میں رکھا ہوا نیا ہائی فائی سیٹ، کیسٹوں کی لائبریری، وی سی آر

زنگین ٹی وی، دنیا بھر کے مشہور گلوکاروں کے پوسٹر اور دیگر بہت سی چیزیں دیکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ اس کی کائنات ابھی برقرار ہے۔

ویسے وہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کی کامیابی کی بنیاد رکھنے میں رئیسہ رفیق کا کتنا ہاتھ تھا؟ اس کا دل کتنا تھا کہ رئیسہ کی مدد صرف اس حد تک ہی اس کے شامل حال نہیں رہی تھی کہ اس نے پہلی مرتبہ ظفر کو ٹی وی پر گانے کا موقع فراہم کیا تھا بلکہ اس کے بعد بھی وہ پس پر وہ رہ کر کچھ ڈوریاں ہلاتی رہی تھی۔ گوکہ وہ اس کا اعتراف نہیں کرتی تھی لیکن ظفر کو یہ یقین اس لیے محسوس ہوتا تھا کہ ابتداء میں بعض اوقات اسے قطعی غیر متوقع طور پر ایسی جگہوں سے بلا دے آئے تھے جہاں کا کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب تو خیر گاڑی چل پڑی تھی، اب کی بات دوسری تھی۔

ہوٹل کی ملازمت اس نے اب بھی نہیں چھوڑی تھی گوکہ اب اسے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن ایک تو دائمی اسے اس جگہ سے کچھ اُنیسیت سی ہو گئی تھی جو اس کے لیے ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوئی تھی۔ دوسرے کچھ چھوٹی چھوٹی مصالحتیں بھی پیش نظر تھیں۔ مثلاً سماجی روابط کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ جاننے والوں پر اچھا اثر پڑتا تھا کہ اس کی نشست و برخاست فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی اور اب تو ہوٹل والے اس سے رعایتی بل وصول نہیں کرتے تھے۔ وہ خواہ تنہا کچھ منگاتا یا ملاقاتیوں کی تواضع کرتا اس کے حساب سے پیسے بالکل نہیں کٹتے تھے اور ہر ماہ گویا ایک اعزازیہ، اسے تنخواہ کی صورت میں مل جاتا تھا۔ ہوٹل والوں کو یہی خوشی تھی کہ اس نے ملازمت ترک نہیں کی تھی اور نہ ہی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔ بلکہ اگر ہوٹل کی اپنی تقریبات میں اس کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ تمام مصروفیات کو پیچھے ڈال دیتا تھا اور اگر اسے پوری پوری رات بھی گانا پڑتا تھا تو گانا تھا اور معاوضہ بھی طلب نہیں کرتا تھا اگر ہوٹل والے خود ہی کچھ دیتے تھے تو لے لیتا تھا۔

ہوٹل کو نہ چھوڑنے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ رئیسہ رفیق جو یہاں آتی تھی۔ کوئی اور ایسی قابل ذکر جگہ تو تھی نہیں جہاں وہ اس سے مل سکتا۔ اس سے اس کا تعلق بھی عجیب بے عنوان سا ہی تعلق تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ اسے محبت کا نام لے یا نہیں؟ ایک خلش تھی، ایک کسک تھی، ایک بے عنوان سا درد تھا۔ وہ اس عورت کو دیکھتا تھا اور دیکھتے ہی رہنا چاہتا تھا مگر اس سے کچھ کہنے کی جرأت دل میں نہیں پاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا یہ اگر محبت تھی بھی تو اس سے کیا حاصل؟

ہے۔“

”بات یہ ہے ظفر! وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی کھلی زلفوں میں مرمی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی: ”کہ تم ٹیوٹرز کی دنیا کی ایک اہم شخصیت بن چکے ہو اور میں سوشلسٹس کے طبقے کی ایک خاص شخصیت ہوں۔ اب عام لوگوں ہی کی نہیں اخباری لوگوں کی نظر پر بھی ہمارے تعاقب میں رہتی ہیں جو اپنے خرچ پر تو نہیں لیکن دعوتوں اور تقریبات کے سلسلے میں یہاں ادھر سے ادھر چکراتے رہتے ہیں۔ اسکیڈل بننے دیر نہیں لگے گی.... اور صرف اخباری لوگوں کو ہی نہیں، میرے اور تمہارے دونوں ہی طبقے کے لوگوں کو بھی اسکیڈل بنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ وہ خود بھی نمک مرچ لگا کر، انسانے تراش کر اپنے شناسا اخباری لوگوں کے پاس دوڑے جاتے ہیں۔ مجھ جیسی عورت جس کے وجود سے جوانی ابھی ایک الزام کی طرح چمپی ہوئی ہے اور جس کا کروڑ پتی لیکن بوڑھا اور اپانچ شوہر گھر پر پڑا رہتا ہے.... اور تم جیسا وجیہ اور معروف نوجوان جس کی نس میں انگلیں تڑپ رہی ہیں اور جو ابھی آسمان کو چھو لینا چاہتا ہے۔ ہمارا اسکیڈل بننا تو بہت آسان ہے ظفر! بہت آسان۔ تم ابھی کم عمر ہو، نادان ہو۔ جینے کے بہت کم گرجتے ہو۔ زمانے کے پل صراط سے صحیح سلامت گزرنے کا فن ابھی تمہیں مکمل طور پر نہیں آیا۔ لیکن مجھے تو بہر حال اپنا شیش محل بچانا ہے۔ ال لیے میں جو کچھ کرتی ہوں، ٹھیک کرتی ہوں میرے دوست! اور پھر جب بات بھی کوئی نہ ہو تو رسوائیاں کمانے سے کیا فائدہ؟“

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ کہ جب بات بھی کوئی نہ ہو تو رسوائیاں کمانے سے کیا فائدہ؟ لیکن یہ تو اس کا خیال تھا کہ بات کچھ نہیں تھی۔ ظفر سے تو اس نے پوچھا ہی نہیں تھا کہ اس کی دھڑکنوں میں کس کے نام کی گونج تھی؟ اس کی آنکھوں میں رئیسہ کو دیکھ کر ستارے کیوں جھللا اٹھتے تھے؟ ان لڑکیوں میں سے کوئی آج تک کیوں اس کی آنکھوں میں نہیں سما سکی تھی جو بڑے اشتیاق سے اس کی طرف بڑھتی تھیں۔

لیکن کیا رئیسہ اس کے محسوسات سے باخبر تھی؟ شاید نہیں۔ مگر وہ اتنی بے خبر بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز جبکہ وہ ریتوران کے ایک بوتھ میں چپ چپ سے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے تو ظفر نے کہا: ”رئیسہ! آپ کو معلوم ہے محبت کسے کہتے ہیں؟“

”ہاں“ وہ خوابناک سے انداز میں مسکرائی۔ ”محبت ایک خوش رنگ پرندہ ہے جس کے تعاقب میں ہم عمر گزار دیتے ہیں۔“

”یاس زدہ فلسفوں کو چھوڑیے رئیسہ!“ ظفر نے ملائمت

وہ اسے پانے کا تو شاید خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ آل کے قدموں میں ٹھوکریں کھاتا ایک سنگریزہ تھا جسے اس نے ازراہ نوازش تراش خراش دیا تھا لیکن اب بھی وہ کوئی ہیرا موتی تو نہیں تھا کہ اس کے تاج میں ٹانکا جاتا۔ رئیسہ ایک فلک بوس چوٹی تھی اور وہ اس کے دامن میں بہتا ہوا ایک چھوٹا سا رسائی نالہ۔ ان کا کوئی میل نہیں تھا، کوئی نسبت نہیں تھی۔ وہ مرتبے میں ہی نہیں، عمر میں بھی اس سے بڑی تھی ظفر کی نظر میں تو اس فرق کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن رئیسہ کا رویہ بتاتا تھا کہ اسے اس فرق کا نہ صرف احساس تھا بلکہ اسی کے باعث اس کے طرزِ عمل میں ہمیشہ ایک جھجک سی آڑے آجاتی تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ پرانی تھی۔ اس عمر سے بھی وہ گزر چکی تھی اور اس طبقے سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا جس میں جذباتیت صنفِ نازک کا بہت بڑا اثاثہ ہوتی ہے اور یہ جذباتیت ہی اس سے نہ جانے کیسی کیسی قربانیاں دلا دیتی ہے۔

سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ اب اس سے بلنا بھی کیا ملنا رہ گیا تھا۔ جوں جوں ظفر احمد کی شہرت بڑھتی گئی تھی، ان کے درمیان گویا فاصلہ بھی کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا تھا۔ ظفر جتنی دیوانگی سے اس کی سمت بڑھنا چاہتا تھا، اتنی ہی رکھائی سے وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی تھی۔ بعض اوقات تو کئی کئی دن گزر جاتے تھے اور وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی اور نہ ہی ایسا موقع پیدا ہونے دیتی تھی کہ ظفر خود ہی اس سے مل بیٹھتا۔ مثلاً نہایت ہی نیک چڑھی قسم کی سیکمات میں گھر کر کھڑی ہو جاتی تھی یا کچھ غیر سیدہ قسم کے سرمایہ داروں سے نہایت مدبرانہ قسم کی نجت و تحیص میں نہمک نظر آنے لگتی تھی اور ظفر چاہنے کے باوجود اس سے مخاطب نہیں ہو پاتا تھا۔

وہ اگر اس سے اچھی طرح ملتی تھی تو صرف اس وقت جب ان کے آس پاس یا تو کوئی موجود ہی نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی اکاؤنٹ شخص موجود بھی ہوتا تھا تو وہ غیر متعلق مانا آشنا یا اپنے آپ میں ہی مگن ہوتا تھا۔

ایک بار ایسے ہی موقع پر ظفر نے قدرے یاسیت زدہ سے لمحے میں اس سے کہا تھا۔

”..... اس سے تو ہم اجنبی ہی اچھے تھے کہ کبھی آپ اپنی فرمائش کی چٹ بھجوا دیا کرتی تھیں اور کبھی ہمارا دل چاہتا تھا تو بلا کھٹکے آپ کی میز پر آ بیٹھتے تھے۔ اب تو جیسے کوئی غیبی ہاتھ ہمارے درمیان اجنبیت اور تکلف کی دیوار کھڑی کر گیا

سے کہا۔ ”یہ بتائیے آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟“
 رئیسہ کی نیم وا آنکھوں میں نہ جانے کتنے ٹھہلے سہرے
 خوابوں کی پرچھائیاں ریگ آئیں۔ کئی لمحے تک وہ کچھ بھی نہ
 بول سکی جیسے الفاظ کے سیلاب نے اسے بولنے کا قرینہ بھلا
 دیا ہو۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے صوفے کے پشتے
 پر سر ٹکالیا۔ اس کے ریشمی بال آج بھی کھلے تھے اور وہ
 دھیرے دھیرے ان میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کی
 نظریں چھت میں آویزاں ایک بہت بڑے فانوس پر تھیں۔
 ”ہاں..... میں نے بہت سی چیزوں سے محبت کی تھی“
 بالآخر اس نے سرگوشی سی کی۔ ”جب میں چھوٹی تھی... مجھے یاد
 ہے ہمارا گھر ایک خوبصورت سرسبز پہاڑی کی ڈھلان پر
 تھا۔ مجھے اپنے اس گھر سے بڑی محبت تھی۔ مجھے ان رنگ برنگے
 پھولوں سے بھی محبت تھی جو ہمارے لان میں پودوں کی شاخوں
 پر جھومتے رہتے تھے اور مجھے اپنے ابو سے بھی محبت تھی جو ایک
 اہم سرکاری افسر تھے۔ وہ پیار سے مجھے روٹی کتے تھے۔ روزانہ
 آفس جاتے وقت وہ برآمدے تک مجھے گود میں اٹھا کر لاتے
 اور میری پیشانی چوم کر پوچھتے۔ ”اچھا روٹی بیٹے! ہم جائیں؟“
 --- میں سر ہل کر انہیں اجازت دیتی اور اپنا تنہا سا ہاتھ ہلا دیا
 کہ انہیں اس وقت تک ٹانٹا کھتی رہتی جب تک ان کی گاڑی
 نظر سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو محسوس
 کیا کہ میری اتنی بڑی گھٹیا اور حریص قسم کی عورت ہیں۔ ان کا
 اپنے درجے کی عورتوں میں اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا اور وہ ہر معاملے
 میں ان سے ممتاز ہونا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش ہوتی تھی
 کہ وہ اگر کسی محفل میں جائیں اور وہاں کسی خاتون کے گلے میں
 ایک لاکھ کانیکس ہو تو ان کے گلے میں سو لاکھ کا لاکٹ ہونا
 چاہیے۔

ابو کی تنخواہ مقول تھی لیکن اتنی نہیں کہ شاہانہ اخراجات
 اور اس کے بعد امی کی خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔ اکثر ان کے
 درمیان تلخ کلامی ہو کرتی۔ ”فلاں صاحب آپ سے جو نیڑ ہیں۔
 ان کی بوی کے بٹھاٹ دیکھیں آپ نے؟ چھٹیاں منانے
 مری کا کہہ کر جاتے ہیں لیکن جاتے سو ٹر لینڈ ہیں۔ معلوم
 ہے آپ کو؟“

ابو بے چارگی سے کہتے۔ ”تم جانتی ہو بیگم! میں ان
 صاحب والاراستہ اختیار نہیں کر سکتا۔“ پھر ان میں
 زور و شور سے بحث شروع ہو جاتی۔

بالآخر ایک دن ابو نے شکست تسلیم کر لی۔

امی کے پسندیدہ ملبوسات، زیورات اور نئے

آرائشی سامان کے انبار لگنا شروع ہو گئے اور ان انباروں
 تلے امی کی روز روز کی جھج جھج دھج دھج ہو گئی۔ اس وقت میں
 بی اے میں تھی جب ایک حادثہ ہوا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟
 رئیسہ نے مخمور سی آنکھوں سے ظفر کی طرف دیکھا۔ ظفر نے
 نفی میں سر ہلا دیا۔

تب وہ گویا اپنے آپ پر ہنستے ہوئے بولی۔ ”مجھے محبت
 ہو گئی۔ اپنی خالہ کے لڑکے سے نہیں جو اپنی لمبی سی کار میں
 اتوار کے اتوار ہمارے گھر آتا تھا اپنی پھونپھی کے لڑکے سے
 بھی نہیں جو اسپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا اور جس نے
 میری سالگرہ پر مجھے ہیروں کے دو جڑاؤ کنگن تحفے میں
 دیے تھے، اپنے آس پاس بلند و بالا کوٹھیلوں میں بسنے والا
 کوئی شہزادہ بھی میرے تصور میں روشنی بن کر نہیں آیا۔ مجھے
 محبت ہوئی تو ابو کے دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک
 کے بیٹے سے۔“

وہ میری کلاس میں پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا، خوبصورت
 اور شرمیلہ سا وہ لڑکا شاعر تھا۔ اس نے مجھ پر بڑی خوبصورت
 نظمیں لکھیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ بہت ہی زیادہ۔
 وہ اتنی پیاری باتیں کرتا تھا کہ جنہیں سنتے دل نہیں بھرتا تھا
 اس کے الفاظ کیلئے بس جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں
 کسی پرسکون جھیل میں کھل اٹھنے والے کنول۔ یا جیسے نکھری
 نکھری فصیح کو سورج کی گندنی کرنوں سے جھلکا اٹھنے والی شبنم
 کی بوندیں۔

دو سال تک میں اس کا ہاتھ تھامے، مدھر خوابوں کی فضاؤں
 میں سفر کرتی رہی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا ”شکیل! گھر
 میں میری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ تم اپنی والدہ کو
 ہمارے ہاں بھیجو۔“

”لیکن کیوں؟“ اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
 ”تاکہ میں تمہارے ساتھ شادی کے لیے حامی بھر سکوں۔“
 میں نے کہا۔

”شادی؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”مگر میں تو تمہارے
 ساتھ شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا رئیسہ! تم میرے ساتھ
 زندگی نہیں گزار سکتیں۔ تم نے شاید میرا گھر نہیں دیکھا۔ وہاں
 طویل وعریض، آراستہ و پیراستہ کمرے نہیں تنگ و تاریک
 کوٹھریاں ہیں جن میں ہم دس افراد رہتے ہیں۔ وہاں فوم والے
 بیڈ اور صوفے نہیں، جھلنگا سی چارپائیاں ہیں جن پر بعض اوقات
 بستر بھی نہیں ہوتا اگر تم ان پر سونے کی کوشش کرو تو تمہاری
 ملائم جلد پر خراشیں پڑ جائیں۔ وہاں میرے پانچ عدد چھوٹے

جہاں بہن ہیں جو اتنے گندے سندے رہتے ہیں کہ اگر تمہاری خوبصورت قمیص کا پلو پکڑ لیں تو مرغی کے پنجوں جیسے نشانات ڈال دیں.... اور وہاں میری ماں ہے جو میلے کپڑوں کا یہ بڑا سا انبار اپنے ہاتھوں سے دھوتی ہے، ڈھیر کا ڈھیر برتنوں کا باجھتی ہے۔ تم ایک دن بھی وہاں نہیں رہ سکتیں رئیسہ! ایک دن بھی

”شکیل! تمہاری بانہوں کا پید بھر سایہ پا کر میں پتھروں کے فرش پر بھی سو سکتی ہوں۔ تم نے میرے جسم کی نزاکتوں کو ہی محسوس کیا ہے، میری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کیا۔ میں سب کچھ سہ لوں گی۔ ہم دونوں مل کر اپنی محبت کی ایک نئی کائنات تعمیر کریں گے“ میں نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔

”یہ سب افسانوی باتیں ہیں رئیسہ!“ اس نے میرا رخسار تھک کر کہا۔ ”تمہارے ابو کبھی اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے اور ان کی مرضی کے خلاف شادی کر کے ہمیں صرف اپنے ہی وسائل پر انحصار کرنا ہو گا جن کا نقشہ میں کھینچ ہی چکا ہوں۔ نہیں.... رئیسہ! یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی“ اور وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔

وہ حقیقت پسند ضرور تھا مگر بے وقوف اور بد دل بھی۔ اس نے میرے حوصلوں کو آزمائے بغیر ہی کی طرف فیصلہ کر لیا تھا۔ اس دن کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملی۔ ابھی میں احساس محرومی کے اس ذہنی صدمے سے ہی نہیں سنبھلی تھی کہ اس سے بھی بڑا ایک حادثہ رونما ہو گیا۔

ابو گرفتار کر لیے گئے۔ انٹی کرپشن والوں نے انہیں عین رشوت لیتے وقت گرفتار کیا تھا۔ پھر ان پر مقدمہ چلنے لگا۔ صرف رشوت خوری ہی کا نہیں، لاکھوں کے عین کا بھی۔ جب ہمارے ماتھوں پر رسوائی کی سیاہیاں بکھر گئیں تو عزیزوں اور رشتہ داروں نے ہمیں پہچانا چھوڑ دیا۔ خالہ کا لڑکا جو اتوار کے اتوار ہمارے ہاں آنا اسی طرح ضروری سمجھتا تھا جس طرح کٹر عیسائی کا چرچ جانا، اب اس کی صورت بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مچھو بھی کالڑ کا جرمی چلا گیا۔ ان کی ماؤں کے بارے میں تو ہمیں معلوم ہی ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو بتاتی ہیں کہ ہم سے ان کی رشتہ داری نہیں تھی۔ بس یوں ہی صاحب سلامت تھی۔ صرف ابو کے جیل جانے سے یہ تبدیلیاں آئی تھیں اُمی اب گھنٹوں میں سروے کر دیا کرتیں اور مجھے ان سے اتنی نفرت محسوس ہوتی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ کبھی کبھی تو مجھے اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ میری سگی ماں ہیں۔

مقدمہ چلتا رہا۔ ہمارے پاس زیادہ نقد روپیہ تو تھا نہیں

سب کچھ و صنعتاریوں اور نمود و نمائش پر ہی اٹھ جاتا تھا۔ لہذا وہ سب قیمتی چیزیں جو بڑے چاؤ سے خریدی گئی تھیں اونے پونے داموں بکنے لگیں۔ کار، ہیروں کے نیکلس، طلائی کلگن.... اور اس کے بعد گھر بلیو استعمال کی چیزوں کا نمبر آیا۔ تمام بھاری بھاری چیزیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔

شام ڈھلے سوگوار سی ویران کوٹھی کے کسی گوشے میں بیٹھے بیٹھے میری آنکھیں نم ہو جاتیں اور میں ڈوبتے دل کو سنبھالنے حسرتناک نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھا کرتی جیسے ابو ابھی کار سے اتریں گے اور مجھے لان پر بیٹھے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر کہیں گے۔

”ہیلو رو بی بی! دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں“ وہ مجھے بلیا کہا کرتے تھے لیکن میں کتنی مجبور تھی۔ ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اُمی پانی کی طرح روپیہ بہا رہی تھیں۔ ابو شاید جیل سے جلد واپس آجاتے لیکن ان پر سرکاری رازوں کی فروخت کا الزام بھی لگ گیا تھا۔ مخالفین نے موقع غنیمت جان کر پرانے حساب بے باقی کرنے کی ٹھان لی تھی۔ سات ماہ بعد ابو ضمانت پر واپس آئے تو ان کی کپٹیوں پر سفید بالوں میں خاصا اتنا فہم ہو گیا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پھیل گئے تھے۔ وہ بات کرتے کرتے بار بار کھانستے۔ میں ان سے لپٹ کر بہت روٹی۔

مقدمہ ابھی چل رہا تھا۔ ابو کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی وہ کسی سے بات نہ کرتے۔ چڑچڑے بہت ہو گئے تھے۔ اکثر خاموشی سے بیٹھے گھنٹوں خلا میں نہ جانے کیا تلاش کرتے رہتے۔ شاید کھویا ہوا قارا اور عزت۔

سرکاری کوٹھی تو مقدمہ شروع ہوتے ہی ہم سے خالی کر لی گئی تھی اور ہم کرائے کے ایک معمولی سے مکان میں آ گئے تھے۔ زندگی کا لاشہ کسی نہ کسی طرح گھسیٹا جا رہا تھا۔ ایک دن ابو باپ سے واپس آئے تو ان کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک خوش لباس شخص تھا جو جیلے ہی سے ذی حیثیت معلوم ہوتا تھا۔ ابو اسی کی شاندار کار میں آئے تھے۔

معلوم ہوا کہ ابو نے ملازمت کے زمانے میں تجارت کا کوئی اہم انٹنس دلوانے میں ان صاحب کی بڑی مدد کی تھی اس وقت سے معمولی سی شناسائی تھی۔ آج ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی تو انہیں ہمارے حالات کا پتہ چلا۔ یہ سلیڈ رفیق تھے۔ میں ان کے لیے چائے لے کر گئی تو انہوں نے گہری نظروں سے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور ابو سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے ”فکر نیکیجیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا“

تھی لیکن انہیں امید تھی کہ میں اس ناگواری سے سمجھوتا کر لوں گی.... اور پھر میرا تھا بھی کون جس کے لیے میں ابو کے فیصلے سے اختلاف کرتی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جس کی خاطر میں لڑتی جسے میں اپنی منزل سمجھ کر ابو کے فیصلے کو ٹھکراتی۔

بڑی دھوم دھام سے میں سیٹھ رفیق کی بیوی بن کر رفیق پلیس میں آگئی۔ جدید ترین فرنیچر، بیش قیمت قالینوں اور تصوراتی خوابگاہوں والی یہ پتھریلی کوٹھی دھیرے دھیرے میرے دل کو بھی پتھر کر گئی۔ اس میں سب کچھ تھا سکون اور محبت کے سوا۔

نا آسودگی کا ایک طویل صحران تھا جس میں میرا سفر شروع ہو چکا تھا۔ تم نے غالباً سیٹھ رفیق کو نہیں دیکھا۔ حادثے میں اپنا بچ ہونے کے بعد تو وہ بالکل ہی کھنڈر ہو گیا ہے لیکن جب میری اس سے شادی ہوئی تھی اس وقت بھی وہ میرے ابو کے برابر ہی لگتا تھا۔ اس کے جبروں کا گوشت لٹکا ہوا تھا، اس کا وزن دو سو تین پونڈ تھا اور اس کے بال جو فرانس کے عمدہ ترین ہیر کٹر سے رنگے ہوئے تھے، درحقیقت آدھے سے زیادہ سفید تھے۔ کثرت میں نوشی اور ہر طرح کی بے اعتدالیوں نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا مگر اس کے گرد خورتوں ہی کا نہیں نوخیز لڑکیوں کا بھی ہجوم رہتا تھا۔ دولت دنیا کا سب سے بڑا مقناطیس ہے نا۔

رفیق کے ساتھ میں زندگی کے کئی برس گزار چکی ہوں لیکن یہ دو تہہ بڑھوں کے کامپلیکس آج تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔ ایک طرف تو انہیں نوجوان لڑکیوں کا شور مچانے کا از حد شوق ہوتا ہے۔ تم ان کی اس مسترت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو انہیں اپنی بیوی کو بنا سناوار کر کسی محفل میں لے جانے اور وہاں سب کی ستائشی نظریں محسوس کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کے لیے بیوی دراصل نازک احساسات، جذبات اور خواہشات کا مجموعہ نہیں صرف ایک ڈیکوریشن بیس ہوتی ہے یا ایک زندہ مجسمہ جسے یہ مختلف تقریبات میں لے جا کر کرسیوں پر سجا دیتے ہیں۔ اھولی طور پر تو اگر یہ بیویوں کو محض ڈیکوریشن بیس سمجھتے ہیں تو انہیں ان کے اعمال و افعال کی بھی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی چاہے، ان کے بارے میں جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بیوی نے اگر ایک نگاہ غلط انداز سے بھی کسی کی طرف دیکھ لیا تو غصے سے پاگل ہونے لگتے ہیں۔

سیٹھ رفیق سے بھی مجھے تقریبات کے سوا کچھ نہیں ملا۔ جب میرا دل چاہتا کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور ملن مٹن

آخر ایک، روز مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ دو سال قید بامشقت اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ۔ جس کی ادائیگی کے لیے صرف دو ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ابو کی قید میں تین سال کا اضافہ ہو جاتا۔ پانچ سال قید کا تصور کر کے وہ زار و قطار رونے لگے۔ میں کانپتے ہاتھوں سے انہیں سہارا دینے کے لیے کٹہرے کی طرف بڑھی۔ اسی کٹہرے پر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ معاً سیٹھ رفیق اٹھ کر آگے آئے اور ایک ہاتھ میرے اور ایک ابو کے کندھے پر رکھ کر بولے۔

”گھبرائیے نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

.... اور پھر سب ٹھیک ہو گیا۔

سیٹھ رفیق نے جرمانہ بھر دیا۔ ابو کے جیل جانے کے بعد بھی وہ ہمارے گھر آتا رہا۔ اس نے ہر طرح سے ہماری خبر گیری کی۔ ہمیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ باہر جاتا رہتا تھا۔ جب بھی باہر سے آتا میرے لیے کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ لے کر آتا۔ ابو سے ملنے وہ کئی مرتبہ ہمارے ساتھ جیل گیا۔ تمہیں یقیناً اس بات پر کوئی حیرانی نہیں ہوگی کہ وہ ہم پر اس قدر مہربان تھا۔

خا ہرے میرے والدین سے اس کا ایک خاموش معاہدہ ہو چکا تھا۔ ایک ایسا معاہدہ جس کے لیے کوئی میٹنگ نہیں بلوائی گئی، کاغذات تیار نہیں کیے گئے، کسی قسم کی گفتگو نہیں کی گئی۔ یہ معاہدہ صرف ذہنوں کے اوراق پر لکھا گیا اور اس پر لگا ہوں کی رضامندی نے دستخط کیے اور جیسے ہی ابو جیل سے رہا ہو کر آئے اس معاہدے پر عملدرآمد ہو گیا۔

تم سمجھ رہے ہونا بہ میری شادی سیٹھ رفیق سے ہو گئی۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ مجھے کوئی خاص دکھ بھی نہیں ہوا۔ میں شاید کچھ بے حس سی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی یہ تو گذشتہ حالات کا منطقی نتیجہ تھا۔ میں لاکھ بڑھی لکھی سہی کچھ ذہین سہی، میرے اپنے کچھ تصورات سہی لیکن کوئی بھی باضمیر لڑکی جیسے جی اپنے والدین کو مصائب کے جہنم میں دھکیلنا پسند نہیں کرتی۔ خصوصاً اس صورت حال میں جیسی کہ میرے ساتھ تھی۔ لڑکیاں ویسے بھی عموماً اپنے والدین کے لیے ایثار پسند ہوتی ہیں۔

مجھے اپنے مظلوم باپ سے بے کراں ہمدردی تھی وہ اتنے کم حوصلہ شخص تھے کہ اب ان میں کچھ سننے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ سیٹھ رفیق کے ہاتھ میں دے کر اپنی دانت میں میرا مستقبل محفوظ کر دیا تھا۔ ناگواری ضرور

کی باتیں کرے اس وقت وہ اسٹڈی میں بیٹھا ڈنارک سوڈن یا جرمنی کے دوروں کے اخراجات کا تخمینہ لگا رہا ہوتا۔ جب میراجی چاہتا کہ وہ میرے روئیں روئیں پر محبتوں کی داستان رقم کرے اس وقت وہ کسی چیک پر دستخط کر رہا ہوتا تھا۔ جس وقت میراجی چاہتا کہ وہ مجھ سے لامتناہی اور لایعنی مگر خوابناک سی باتیں کرے اس وقت وہ ٹیلیفون پر کاروبار کی باتیں کر رہا ہوتا تھا۔ اس نے گھر پر بھی ٹیلیکس مشین لگوا رکھی ہے۔ ایک پارٹ ٹائم ٹیلیکس آپریٹر اس وقت بھی گھر آتا تھا اور رفیق دفتر سے آنے کے بعد بھی گویا دفتر میں ہی رہتا تھا۔

بقول اس کے میں اس کے لیے بہت زیادہ خوش بخت ثابت ہوئی تھی کہ اس کا کاروبار زیادہ سے زیادہ پھیلتا جا رہا تھا لیکن سمندر کا کنارہ تو ڈھونڈنے سے مل جاتا ہے مگر دولت کی ہوس کا کنارہ نہیں ملتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیٹھ رفیق کتنی دولت کمانا چاہتا ہے جبکہ اس کے پاس دولت کا پہلے ہی کوئی شمار نہیں تھا.... اور پھر جتنی تیزی سے اس کے پاس مزید دولت آتی جا رہی تھی، اتنی ہی تیزی سے اس کے سینے میں بچی کھچی محبت کے بے شمار پودے بھی سوکھتے جا رہے تھے بحال ازدواجی زندگی کی نا آسودگی سے قطع نظر وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے اور میری بھی یہی کوشش رہی ہے کہ اس کے اعتماد کو، اس کے دل کے آگینے کو کبھی میری وجہ سے ٹھیس نہ لگنے پائے۔ آج تک تو میں اس کوشش میں کامیاب ہی رہی ہوں۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بیگم رئیسہ رفیق خاموش ہو گئی۔ وہ گوکہ سرگوشی مناجات میں ہی بات کر رہی تھی لیکن وہ خاموش ہوئی تو گویا کائنات ہی خاموش ہو گئی۔ ظفر جیسے کسی خواب سے چونکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے، کیا تبصرہ کرے۔ رئیسہ کا ظاہر تو وہ دیکھتا آیا تھا، آج اس کے باطن کی پُر اسرار محل سراؤں میں جھانک کر تو وہ جیسے بُت ہی بن گیا تھا۔

”.... تو یہ ہے میری کل داستانِ حیات، رئیسہ رفیق نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا اور کھوکھلے سے انداز میں ہنس دی۔ ظفر اس ہنسی میں اس کا ساتھ تو نہیں دے سکا۔ وہ عورت جو اسے اجھٹا اور ایلووا کے غاروں سے زیادہ پُر اسرار لگتی تھی۔ آج وہ اسے ایک شفاف جھیل کی طرح بوکھائی دینے لگی تھی اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ دل کو بھانے لگی تھی، جو اس پر جھانے لگی تھی۔ وہ بس سحر زدہ سا اس کے سامنے بیٹھا ایک ٹنگ لے دیکھے جا رہا تھا۔

دفعۃً وہ چونک کر بولی: ”ارے.... آج میں تم سے

جو خاص بات کرنا چاہتی تھی، وہ تو بھول ہی گئی۔ اگلے اوار کو ہماری شادی کی سالگرہ ہے جو ہم گھر کے لان پر ہی سوئمنگ پول کے کنارے مناتے ہیں کیونکہ رفیق کو وہیل چیئر بیٹھ کر ہوٹل کے ہال میں آنا اچھا نہیں لگتا۔ ہمیں اس تقریب میں نہ صرف شرکت کرنی ہے بلکہ بہت کچھ سنانا بھی ہے۔ تقریب کو رنگ لگا دینا ہے.... ایسا کہ سب یاد کریں۔“



تقریب کا عروج دیکھ کر ظفر کی عقل دنگ تھی۔ یوں تو وہ آئے دن ہی نئی تقریبات دیکھتا تھا، ان میں شرکت کرتا تھا اور اس کا بیشتر وقت ایسے ہی ماحول میں گزرتا تھا جہاں دولت مند کے مظاہرے عام تھے مگر اس تقریب نے اسے سارے تجربے بھلا دیے تھے۔

کہنے کو یہ محض شادی کی سالگرہ تھی اور گھر میں منعقد ہو رہی تھی مگر تقریب کیا تھی گویا پورے شہر کی آنا کا سوال تھی اور گھر کیا تھا گویا کسی شہنشاہ کا قلعہ تھا جسے کسی ماہر تعمیرات نے جدید رنگ دے دیا تھا اور جو شخص اس تقریب کا ماحول نہیں حقیقتاً دولا تھا، وہ چلنے سے تو کید ہلنے جلنے سے بھی معذور تھا اور ایک عجیب ساخت کی وہیل چیئر پر نیم دراز تھا جسے ایک ملازم اس کے اشارے پر ادھر سے ادھر دھکیلتا تھا۔ رئیسہ نے اس سے ظفر کا تعارف کرایا تھا۔

ظفر عجیب سی نظروں سے دیر تک سیٹھ رفیق کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ ناکارہ مگر بھاری بھر کم جتنے کا مالک تھا۔ چہرے پر شکنیں تھیں اور پوپٹے اور جبریلوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اس کے سونٹ سیاہی مائل تھے جن کے درمیان ایک موٹا سا سکار دبا ہوا تھا جس کی خوشبو دور تک پہنچتی تھی۔ سکار سے ہی نہیں، اس کے پورے وجود سے خوشبوئیں پھوٹی تھیں مگر کچھ بھی اس کے قریب جانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور وہ اس خوشبو کا شور مچا جو ظفر کو دنیا کی حسین ترین عورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس وقت مہمانوں کے درمیان اپنی توجہ کا خزانہ بانٹ رہی تھی۔ کبھی اس ٹولی کے پاس، کبھی اس ٹولی کے پاس۔

ظفر اس ہجوم میں کھویا کھویا سا پھر رہا تھا۔ لان اتنا بڑا تھا کہ اوسط درجے کے کسی اسٹیڈیم کی برابری کرتا نظر آتا تھا۔ اور ظفر حیران تھا کہ اس شہر میں جہاں لوگوں کو پینے کے لیے پانی بشکل میسر آتا تھا، کیونکہ اسے سرسبز و شاداب رکھنا ممکن تھا، لان کے وسط میں سوئمنگ پول تھا جس کا پانی چاندنی اور رنگ برنگی روشنیوں میں کسی ہفت رنگی سیال دھات کی طرح جھللا رہا تھا۔

اس سوئمنگ پول کے ارد گرد بھی ایک چھوٹا سا سمندر بلکورے لے رہا تھا۔ رنگوں، خوشبوؤں اور حسن ووجاہت کا سمندر۔ کہیں مذاحول کا ہجوم تھا تو کہیں ان پر مہنوروں کی طرح منڈلاتے مردوں کی ٹولیاں۔ کہیں ہیرے جھلما رہے تھے تو کہیں سونا چمک دکھا رہا تھا۔

باوردی ویٹر مہانوں کے درمیان چکرارہے تھے اور ہر اشارے، ہر حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ کھانوں، مشروبات اور دیگر لوازمات سے لدی بھندی ٹرا لیاں ادھر سے ادھر گردش کر رہی تھی اور اتنے ہجوم و اتنی ہلچل کے باوجود شور نہیں تھا۔ افراتفری نہیں تھی۔ صرف نیچی آوازوں اور سرگوشیوں میں باتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ دبے دبے قدموں کا ترنم تھا۔ کسی ان کی باتوں کا تاثر گویا فضا میں گھلا ہوا تھا۔ سارا ماحول ظفر کو کسی خواب کی پیداوار لگ رہا تھا جس میں وہ یوں اجنبی اور غیر متعلق سا بنا ہوا ادھر ادھر پھر رہا تھا جیسے اس کا وجود غیر متعلق ہو اور کوئی بھی اسے نہ دیکھ رہا ہو۔ اس کا کوئی شناسا وہاں نظر نہیں آ رہا تھا اور اس میں خود کسی سے متعارف ہونے کی اہلیت نہیں تھی۔

رئیسہ رفیق کبھی کبھی اس کے قریب سے گزرتی تو دو انگلیاں ہلکے مسکرا کر ”ہائے“ کہہ جاتی اور مہانوں کی کسی اور ٹولی کی طرف بڑھ جاتی۔ لان کے بیشتر حصوں پر روشنی کی رسائی کم تھی اور مہانوں کی ٹولیاں وہیں کھڑا ہونا زیادہ پسند کر رہی تھیں ظفر بھی لمبھی روشنی میں کھڑا تھا جب قریب سے گزرتی ایک لڑکی نے اسے پہچان لیا۔

”ارے... آپ تو وہی نہیں ہیں جو بیوی پر گانے وانے گاتے ہیں.... غالباً ظفر احمد نام ہے آپ کا؟“ وہ جوشیلی مگر دبی دبی آواز میں بولی۔

ظفر نے متانت سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ تب وہ سوکھا سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے ٹینک کتے ہیں۔“

ظفر نے مشروب کا گلاس دوسرے ہاتھ میں مقام کراس سے ہاتھ ملایا۔ ٹینکا کا ہاتھ استخوانی تھا مگر اس میں جذبوں کا گداز اور لہو کی حرارت موجود تھی۔ ظفر کے اعصاب میں ہلکی سی گدگدی ہوئی جو ہاتھ کے جدا ہوتے ہی معدوم ہو گئی۔ وہ کچھ دیر کھڑی اس سے باتیں کرتی رہی پھر آگے بڑھ گئی اور شاید اسی کی زبانی ظفر کی موجودگی کی خبر نوجوان طبقے میں پھیل گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد لڑکے اور لڑکیوں نے ظفر کو گھیرنا شروع کر دیا۔ ہر قبیل کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ظفر سے طرح

طرح کے سوالات کر رہی تھیں۔

”مسٹر ظفر! آپ کو معاوضہ تو بہت ملتا ہو گا ٹی وی سے؟“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ کپڑوں کی سلائی کا خرچ پورا ہو جاتا ہے،“ ظفر نے جواب دیا۔ سب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا انہیں یقین نہ آرہا ہو۔

ایک لڑکا جس کی جینز پر چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے اور جس کے بال اپنی ساتھی لڑکی سے بھی لمبے تھے انگریزی میں بولا۔

”مسٹر ظفر! ہم تین لڑکوں نے مل کر ’تھری ڈینز‘ کے نام سے ایک میوزک کلب بنایا ہے اور ہمارا ارادہ ہے کہ ہم امریکا اور انگلینڈ جا کر وہاں دھوم مچا دیں۔ آپ ہمیں رہنمائی دینے کے لیے کچھ وقت نکال سکتے ہیں؟“

”آپ پہلے یہاں دھوم کیوں نہیں مچاتے؟“ ظفر نے سادگی سے پوچھا۔

”یہاں تو ہم دھوم مچا چکے ہیں۔ پچھلے تین سال میں ہم تین ہوٹلوں میں پروگرام پیش کر چکے ہیں۔ نوجوانوں نے فخر سے بتایا۔“ اور ہر ایک میں سامعین کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں تھی۔ ہلکا سا ہرجانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں اردو میں گانا تو آتا ہی نہیں.....“

اس گفتگو کے مزید آگے چلنے سے پہلے ایک لڑکی نے ظفر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کا بازو ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر ظفر! آج آپ یہاں بھی کچھ سنا رہے ہیں یا نہیں؟“

”ہاں۔“ ظفر نے جواب دیا۔ ”کھانے پینے سے لوگوں کی توجہ خدائے تو پھر میں ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ سترہ اٹھارہ سال کے ایک لڑکے نے اچانک ہی پریشیا

لجے میں ظفر سے پوچھا۔

”آپ کی گرل فرینڈ کتنی ہیں مسٹر ظفر؟“

”ایک بھی نہیں۔“ ظفر نے صداقت سے جواب دیا۔

”ایک تو آپ سٹوڈنٹس کے لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ ایک موٹی سی لڑکی نے بلا وجہ اٹھلا کر کہا۔

”اگر کوئی ایک بھی میری گرل فرینڈ ہوتی تو کیا اس وقت میرے ساتھ نظر نہ آتی؟“ ظفر نے انصاف کیا۔

اس قسم کی اوٹ پانگ گفتگو چلتی رہی۔ اس دوران دو

لڑکیوں نے سوسے کے نوٹوں پر ظفر کے آؤ گراف بھی لیے اور تھوڑی دیر بعد وہ سب ظفر کو تنہا چھوڑ کر ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔

کھانوں اور مشروبات کے بعد ’پوسٹ ڈنر آئٹم‘، یعنی

کو سمجھے آنے کا اشارہ کیا۔ ظفر شاخ گل کی طرح پلکتی اس کی مکر پر نظر جمائے اور چڑھنے لگا۔ دوسری منزل کی بالکونی میں داخل ہو کر رئیس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر ایک مدھم سی لائٹ آن کر دی۔

ظفر بھی کمرے میں داخل ہو چکا تو رئیس نے دروازہ بند کر کے مقفل کر دیا۔ ظفر نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ خوابگاہ تھی۔ ایسی ہی خوابگاہ جیسی لوگ عموماً صرف خوابوں ہی میں دیکھتے ہیں۔ یہاں کی ہوا میں ایک مسحور کن خوشبو رچی ہوئی تھی۔

”اگر ہم صبح راستے سے آتے تو شاید کوئی ملازم ہمیں دیکھ لیتا۔“ رئیس نے گری سانس لے کر کہا اور بالوں کا جوڑ اکھول لیا۔ کمرے میں ایک نئی مہک پھیل گئی۔ ظفر خاموش کھڑا تھا۔ ”یہ ہے میرا گوشہ عافیت“ رئیس اس کی طرف مڑ کر دھڑو ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”جب میرا اس طویل و عریض کوٹھی میں کہیں دل نہیں لگتا اور سیٹھ رفیق کا وجود میرے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو میں آنکھ بچا کر یہاں آجاتی ہوں۔ یہاں کتابیں ہیں، معروف شاعروں کے دیوان ہیں، المیہ نمونوں کے کیسٹ ہیں.... اور.... اس بستر میں رچی ہوئی میرے آنسوؤں کی نمی ہے۔“ اس نے نہایت خوبصورت ڈبل بیڈ کی طرف اشارہ کیا جسے دیکھتے ہی آنکھوں کو آرام کا احساس ہوتا تھا۔

وہ بظاہر ہتھکڑی عورت نظر آتی تھی مگر اس کے سینے میں ایک نہایت حساس دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی یہی خوبی ظفر کو اس کا دیوانہ بنائے جا رہی تھی۔ اس کی ذات ان گنت تنوں میں چھپی ہوئی تھی لیکن ہر تہ ہٹتی تھی تو اندر سے اس کا زیادہ خوبصورت روپ ہی نکلتا تھا۔ ظفر کو اس لمحے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اس عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔

اس احساس کے ساتھ ایک عجیب سا خوف بھی تھا جو اس کے دگ وپے میں خون کو جمائے دے رہا تھا۔ اس کا گلا ایک بار پھر خشک ہوا جا رہا تھا جیسے اس نے گھنٹوں گایا ہو۔ ہونٹ گویا پتھر اٹے جا رہے تھے۔

”ارے.... تم ابھی تک کیوں کھڑے ہو؟“ رئیس گویا چونکتے ہوئے بولی۔ ”ادھر آؤ.... یہاں بیٹھو۔“ اس نے ظفر کا ہاتھ تھام لیا اور ایک بار پھر چونکتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا ہاتھ تو برف کی طرح سرد ہو رہا ہے۔“

”میں کچھ عجیب سا خوف محسوس کر رہا ہوں.... چوروں جیسا۔“ ظفر نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”میں تمہارے خوف کو سمجھتی ہوں۔“ وہ ہمت افزا انداز میں

بعد اظہام چیز کی باری آئی اور وہ تھا ظفر احمد۔ جب مہمان پرست پرستے لگے تو رئیس اسٹیج پر اس حصے کی طرف بڑھی جہاں ان کے ایک سرے پر بنایا گیا تھا اور جس پر خوب تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر مالک بھی نظر آ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے اسٹیج پر پہنچ کر رئیس نے اعلان کیا۔ ”خواتین و حضرات! گلوکار ظفر احمد کا نام کون نہیں جانتا۔ ٹی وی پر کامیابی کے تھنڈے گاڑنے کے بعد اب انہوں نے فلم کے لیے بھی گانا شروع کر دیا ہے۔ آج وہ ہمارے لیے گائیں گے۔“

جن مہمانوں کو تالیاں بجانے کا ہوش تھا انہوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ظفر احمد نے گانا شروع کیا اور حسب روایت رنگ جمایا۔ اس نے فلمی نغمے، گیت، غزلیں اور لوک گیت سب کچھ ہی سنایا۔ اس کے پاس سندھی، بلوچی، پنجابی اور انگریزی نمونوں کی فرمائشیں بھی آئیں۔ مہمانوں میں ہر قومیت کے لوگ موجود تھے اور اس وقت انہیں اپنی اپنی مادری زبان آگئی تھی ظفر نے کم از کم ایک نغمہ تو ہر زبان ہی کا یاد کر رکھا تھا لہذا وہ سب ہی کی فرمائش پوری کر کے وار سمیٹا رہا۔

محفل جب شب بپہنچ رہا تھا تو ظفر نے سیٹھ رفیق کی ویل چیر کر کوٹھی کی اصل عمارت کی طرف جاتے دیکھی۔ نرس اس کے ہمراہ تھی۔ اس میں شاید محفل کا مزید ساتھ دینے کی ہمت نہیں رہی تھی اور وہ آرام کرنے چل دیا تھا۔

اس کے کئی گھنٹے بعد جب سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا تب مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے۔ کچھ دیر بعد وہی جگہ جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ نگیں تھی، اجڑا دیار نظر آنے لگی۔ گاتے گاتے ظفر کا سر ہلکانے لگا تھا اور اس وقت وہ سوئمنگ پول کے مرمر کنارے پر بیٹھا یخ مشروب پی رہا تھا۔

مہمانوں کا آخری جوڑا بھی رخصت ہو چکا اور سرے اور دیگر ملازمین وغیرہ بھی نہ جانے کہاں غائب ہو چکے تب رئیس ظفر کے پاس آئی اور سرگوشی کے سے لہجے میں بولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ ظفر مشروب کا گلاس اور جگ وپے سوئمنگ پول کے کنارے رکھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ کوٹھی کی اصل عمارت کے گرد گھوم کر پچھلی طرف جا رہی تھی۔ ظفر کا خیال تھا کہ اس طرف سرونٹ کو آرٹیز ہوں گے مگر سرونٹ کو آرٹیز اسے راستے میں کہیں نظر نہیں آئے۔ شاید وہ کوٹھی کے پرلی طرف تھے۔

رئیس کوٹھی کے عقب میں ایک ایسی جگہ لگی جہاں سے بل کھاتا تنگ سائینہ جو غالباً مہنگامی حالات میں استعمال کے لیے بنایا گیا تھا، اوپر جا رہا تھا۔ رئیس اس پر چڑھنے لگی اور ظفر

میں دھک سی محسوس ہو رہی تھی۔ آج گویا سورج، چاند ستارے اس کی مٹھی میں آگئے تھے۔

چوتھے جام کے بعد رئیسہ نے اٹھ کر الماری سے شب خوابی کا ایک لہاوہ نکالا اور باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ شب خوابی کے لہاوے میں باہر آئی تو کمرے میں روشنی مدھم ہونے کے باوجود ظفر کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ظفر کے حواس پر دھند بڑھتی جا رہی تھی ایک اور جام کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے بے اختیار رئیسہ کی طرف ہاتھ بڑھایا حالانکہ اسے خود بھی صحیح طور پر احساس نہیں تھا کہ اس حرکت سے اس کا مقصد کیا ہے۔ بس ایک دیوانگی سی تھی جو ذہن میں قدم جا رہی تھی۔

رئیسہ فوراً کھسک کر اس کے ہاتھ کی رسائی سے دور چلی گئی اور تحکمانے میں بولی: ”یہ نہیں ہوگا ظفر! میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی نا آسودہ ازدواجی زندگی سے پریشان ہو کر خلوٹوں کے سہارے ڈھونڈ لیتی ہیں اور چوری چھپے ان ہی کے سہارے زندگی کو بھلائی رہتی ہیں۔ اس طرح میسر آنے والی کیف و انبساط کی گھڑیاں مجھے بھیک میں ملی ہوئی لگتی ہیں۔ میں تشنہ کام ضرور ہوں، مہیں خلوت میں لے آئی ہوں اور تمہاری محبت سے میرا دل مسخر بھی ہے لیکن بس۔ اس سے آگے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میری قوت ارادی کا امتحان بھی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ میں امانت میں خیانت کی مرتکب نہیں ہو رہی۔“

”یہ فلسفہ... میری کچھ... سمجھ میں نہیں آیا...“ ظفر نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا اور مزید کچھ کہنے سے بغیر اٹھ کر رئیسہ پر جھپٹا۔ رئیسہ تو چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے بچ گئی لیکن وہ نہ جانے کس چیز سے ٹکرا کر گر پڑا اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

آنکھیں دوبارہ کچھ دیکھنے اور ذہن کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو اس نے اپنے آپ کو صوفے پر لیٹا ہوا پایا۔ رئیسہ صوفے کے بٹے پر بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ شب وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔ رئیسہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی خمار کے ڈورے تھے اور جب وہ بولی تو آواز بھی بوجھل تھی لیکن وہ ظفر کے مقابلے میں قطعی ہوش و حواس میں تھی۔

”میں یہ کتنا چاہتی تھی...“ اس نے یوں بات شروع کر دی گویا کچھ سما ہی نہ تھا: ”کہ میں جسمانی طور پر صرف اس شخص کی ہو سکتی ہوں جس سے میری باقاعدہ شادی ہوئی ہو۔“

”میں تو ابھی اور اسی وقت تم سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“

اس کا ہاتھ پھتھپاتے ہوئے بولی: ”ایک تو تم میرے طبقے کے آدمی نہیں ہو پھر پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہو۔ خصوصاً اس کمرے میں... اور وہ بھی چوری چھپے۔ ایک احساس تمہیں یہ بھی ہے کہ مجھے میرا شوہر موجود ہے۔ معذوری سہی لیکن بہر حال شوہر تو ہے لہذا تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم اپنے خوف سے خوفزدہ مت ہوؤ... یہ خود بخود ہی دھیرے دھیرے کہیں تحلیل ہو جائے گا، بیٹھو! اس نے ظفر کو ایک ایسے صوفے پر بٹھا دیا جو ذرا فاصلے سے محض دھکی ہوئی روٹی کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ ظفر اس پر بیٹھا تو گویا قالین تک دھنستا ہی چلا گیا۔

رئیسہ اسے بٹھا کر کپڑوں کی دیوار گہر الماری تک گئی اور اس کا سلاڈنگ ڈور ایک طرف ہٹایا جو دیوار ہی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ الماری میں لٹکے ہوئے طبوسات زیادہ تر شب خوابی ہی کے معلوم ہوتے تھے۔ رئیسہ نے الماری کے کسی خفیہ خانے سے ایک بونل اور دو گلاس نکالے اور ظفر کے سامنے ٹیشے کی تیانی پر لار کھے۔ پھر اس نے کمرے میں موجود چھوٹے سے فرج سے برف کے کیوب وغیرہ نکالے۔ لوازمات مکمل ہونے کے بعد وہ ظفر کے قریب بیٹھ کر جام تیار کرنے لگی۔

ظفر باقاعدہ پینے والوں میں سے نہیں تھا لیکن جس کے ہاتھوں سے جام مل رہا تھا اس کے لمس سے گویا اس کی تمام خباثت ختم ہو گئی تھی۔ رئیسہ نے اس کے گلاس سے گلاس ٹکرائے ہوئے کہا: ”ان بے عنوان محبتوں کے نام جن کا انجام ابھی اندھیرے میں ہے۔“

رئیسہ نے جام پر جب ظفر کی رگ و پے میں محبتی ہوئی برف سی کہیں تحلیل ہو گئی اور اس کے کانوں کی یوں یوں تپنے لگیں جیسے ابھی جل اٹھیں گی تو اس نے لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

”رئیسہ... رئیسہ! مجھے تم سے محبت ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ خمار سے بوجھل مگر مطمئن لہجے میں بولی: ”اسی روز سے معلوم ہے جس روز پہلی بار نظریں ملی تھیں۔ نظروں کی زبان عورت سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔“

”کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟ ظفر نے تصدیق چاہی۔“

”کیا میرے خفیہ گوشہ خلوت میں میرے برابر بیٹھ کر مجھے یہ سوال کرنے کی ضرورت باقی ہے؟ اس نے براہ راست ظفر کی آنکھوں میں جھانکنا۔ وہ آنکھیں ظفر کو گویا اپنا ٹائمر کر دیتی تھیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکالیں اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گیا۔ اس احساس سے کہ رئیسہ کو بھی اس سے محبت ہے، اس کا دل اس شدت سے دھڑکنے لگا کہ کپٹیوں

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ظفر بولا۔ وہ اب اپنی ذہنی حالت خاصی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ بے ہوشی کا وقفہ خواہ طویل تھا یا مختصر ہر حال اس کے حق میں اچھا ثابت ہوا تھا۔

”لیکن یہ تقریباً ناممکن ہے“ رئیسہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

”کیوں؟ اس میں ناممکن والی کیا بات ہے؟ تم سیٹھ رفیق سے طلاق لے لو۔ عدت کی مدت پوری ہوتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ میں اس کی انا کا مسئلہ ہوں“ رئیسہ گہری سانس لے کر بولی۔

”اور پھر میں حقیقت پسند بن کر بھی سوچتی ہوں تو طلاق لینا مجھے سراسر گھاٹے کا سودا نظر آتا ہے۔ محبت اپنی جگہ اور سنگلاخ حقیقتیں اپنی جگہ۔ میں اس شاہانہ زندگی، آرام و آسائش اور سماجی برتری کی عادی ہو گئی ہوں۔ اس کے بغیر میرا گذارا نہیں ہو سکے گا۔ میں سولہ سترہ سال کی لڑکی نہیں ہوں جو محبت میں پاگل ہو کر سوچوں۔ رفیق سے طلاق لینے کی صورت میں مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میں بالکل خالی ہاتھ اس گھر سے نکلوں گی۔ حتیٰ کہ سماجی مرتبہ بھی مجھ سے چھن جائے گا۔ میں بالکل ایک عام سی عورت رہ جاؤں گی۔ ایک تہی دست مطلقہ اور مجھے تہی دست اور عام عورت بننا بالکل پسند نہیں۔ جبکہ رفیق کی موت کی صورت میں اس کی ہر چیز کی مالک میں بن جاؤں گی۔ میں وہ پانے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

ظفر صوفے پر لیٹا ٹکڑے ٹکڑے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا چند لمحے رئیسہ اس کی طرف دیکھے بغیر مضطربانہ انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی پھر خود کلامی کے سہلے لہجے میں بولی۔

”رفیق ایک گرتی ہوئی دیوار ہے... اسے صرف ایک ہلکے سے دھکے کی ضرورت ہے... ورنہ شاید وہ اسی حالت میں برسوں راستہ روکے کھڑی رہے...“ دفعۃً اس نے جیسے چونک کر ظفر کی طرف دیکھا۔

”کیا تم اتنی سی ہمت نہیں کر سکتے؟“

”کس بات کی ہمت؟ ظفر نے سادگی سے پوچھا۔

”گرتی ہوئی دیوار کو دھکا دینے کی تم اگر ذرا سی جرأت کرو اور رفیق کو قتل کر دو تو ہمیں ایک نئی زندگی مل جائے گی... لیکن اسے میری فرمائش یا میرا اصرار مت سمجھنا... دوسرا راستہ تو ہمارے سامنے ہے ہی کہ یونہی ایک دوسرے کو نہ پاسکے کی آگ میں جلتے جلتے عمر گزار دیں۔“

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا“ ظفر نے بے اختیار کہا اور اسے احساس ہوا کہ اس کے پتے ہوئے رخساروں پر آنسو بہ رہے ہیں۔

”تو پھر تمہیں وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو میں نے بتایا ہے۔“ وہ بولی اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر کمرے میں ٹپکنے لگی۔

”لیکن اس صورت میں مجھے تم کہاں ملو گی؟ مجھے تو سزائے موت ملے گی۔“ ظفر کراہا۔ ”قتل... اور وہ بھی سیٹھ رفیق کا۔“

”نہیں۔ سزا تو تمہیں تب ملے گی نا جب تم پر قتل کا الزام آئے گا۔“ وہ دوبارہ صوفے کے ہتے پر آ بیٹھی۔ ”آخر کبھی کبھار چور اور ڈاکو بھی تو لوگوں کے گھروں میں ٹھس آتے ہیں اور رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں اہل خانہ کو ہلاک کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ ایسا کوئی حادثہ رفیق کے ساتھ بھی تو پیش آ سکتا ہے۔“

ظفر کا ذہن اب سوچ بچار اور باریکیوں کو سمجھنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا تاہم وہ صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

”میں اس میں تمہاری حتی الامکان مدد کر سکتی ہوں“ رئیسہ بولی۔ ”میں تمہیں اندر آنے اور رفیق کے کمرے تک پہنچنے کا موقع فراہم کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ وہ کس وقت بالکل تنہا ہوتا ہے... اور... اور... اور میں یہ گواہی بھی دے سکتی ہوں کہ یہ سب کچھ کسی ڈاکو ہی کی کارروائی تھی۔ میرا ساتھ میسر ہونے کی صورت میں تمہیں قطعاً کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“

”میرا خیال ہے... کہ... مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ یہ میری مجبوری ہے... میں نے بہت صبر کیا ہے... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ رئیسہ کو تم کہنے لگا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ تفصیلات ہم پھر کبھی ملے کر لیں گے۔ اب صبح کا اجالا پھیل رہا ہے۔ اب تم جاؤ۔ چلو میں پچھلے گیٹ تک تمہیں چھوڑنے چلتی ہوں“ رئیسہ نے کہا۔



راہداری میں بھی دبیز قالین موجود تھا اور ظفر کے قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ مدھم روشنی میں دیواروں کا پیٹ سطح آب کی طرح جھللا رہا تھا۔ سیٹھ رفیق کے کمرے سے چند قدم پہلے ظفر رک گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانس لینے لگا۔ اس نے کچھ زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا لیکن اس کی سانس پھول رہی تھی۔

سیٹھ رفیق کے کمرے کے دروازے پر غمخیز گدے والی ایک خوبصورت کرسی پڑی تھی۔ اس پر شاید کبھی کبھار نرس بیٹھتی تھی۔ ویسے نرس کا کمرہ سیٹھ رفیق کے کمرے سے ملحق تھا اور وہ گھنٹی بجا کر کسی وقت بھی اسے بلا سکتا تھا۔ لیکن ہفتے میں صرف ایک رات کے لیے نرس اپنی مال کے پاس چلی جاتی

تھی اور علی الصباح واپس آجاتی تھی۔ آج وہی رات تھی۔
ظفر بھلی دیوار بچاند کر کوٹھی میں داخل ہوا تھا اور سر پہنچ
اسے حسب پروگرام مطلوبہ حالت میں ملی تھی۔ کتنے نہ جانے کہاں
غائب تھے۔ چونکہ رات تو ویسے بھی صرف سنانے والے گیٹ پر
موجود رہتا تھا وہ آگے آیا تو برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک
عظیم الشان کچن کا عقبی دروازہ اسے اس حالت میں کھلا ہوا
لانا تھا کہ بعد میں معائنہ کرنے والے یہی سمجھتے کہ چور ادھر کا تالا
توڑ کر اصل عمارت میں داخل ہوا تھا۔ راستے میں دو اور دروازوں
کے تالے بھی اسے اسی حالت میں کھلے ملے تھے جیسے انہیں
کسی اوزار سے کھولا گیا ہو۔ اس راستے کا نقشہ رئیس نے ظفر
کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا جس سے گزر کر اسے سیٹھ رفیق کے
کمرے تک پہنچنا تھا.... اور اب وہ اس کمرے سے چند قدم
کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس نے پورے ایک ماہ اس معاملے پر غور و خوض کیا
تھا۔ اس دوران اس کی رئیسہ سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں جن
میں سے کچھ اسی خفیہ گوشہ تنہائی میں ہوئی تھیں جہاں پہنچ
کر ظفر کی روح گویا خوابوں کی کسی انوکھی ہی دنیا کے سفر پر نکل
جاتی تھی لیکن اس کی حالت اس پیسے ہی جیسی رہی تھی
جس کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر ہر بار ہٹایا جاتا ہو۔ طلب
نے اسے دیوانہ کر دیا تھا اور بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ
اس نے پہلی بار جو بات کہی تھی وہ بالکل درست تھی۔
”... مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ یہ میری مجبوری ہے.... میں
تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا“

وہ بہر حال ایک انسان ہی تھا۔ محبت سے قطع نظر بھی
سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب وہ سوچتا تھا کہ رئیسہ
کے دامن میں اس کے لیے محبت کے علاوہ بھی کیا کچھ نہیں
تھا تو اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگتی تھی۔
شہرت تو وہ کہا ہی چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کے گاؤں
والے بھی اسے ٹی وی پر دیکھتے ہوں گے اور ان میں سے بیشتر
اسے پہچانتے بھی ہوں گے اور پرجوش لہجے میں ایک دوسرے
کو بتاتے ہوں گے۔ ”ارے یوہی چوہدری نذر احمد کا لڑکا
ہے.... وہی پٹلا سا چھوٹا جو بیاں کھیتوں میں مارا مار پھرتا
تھا.... اور اگر کسی کو چٹا بجاتے دیکھ لیتا تھا تو وہیں بُت
بن کر کھڑا ہو جاتا تھا.... کجنت اس چھوٹی سی عمر میں بھی
ہیر بہت غضب کی گاتا تھا۔“

کبھی کبھی ظفر حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ کیا اس کا باپ
بھی اسے ٹی وی پر دیکھتا ہوگا؟ اگر دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہو

گا؟ کیا اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا ہوا ہوگا؟ نہیں۔
نہیں... اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس نے کبھی ظفر سے رابطہ قائم
کیا ہوتا۔

دفعۃً اسے آسیہ یاد آگئی۔ گاؤں میں ان کے برابر والے
گھر میں رہنے والی بیوہ کی وہ لڑکی جس سے ظفر کی آخری ملاقات
اس وقت ہوئی تھی جب وہ ہند رہ سولہ برس کی تھی۔ چنبیلی
کی کھلی کی طرح سفید اور نرم و نازک سی وہ عجیب لڑکی۔ کتنے
کو وہ دیہاتن تھی۔ گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی تھی مگر اس کی
نزاکت تھی کہ بھولوں کو شرماتی تھی، حُسن تھا کہ چھینٹ کے معمولی
اور بے ڈھب کپڑوں میں بھی آنکھوں کو جھپکنا بھلا دیتا تھا۔

ظفر کو معلوم تھا کہ آسیہ اسے چاہتی تھی مگر اس وقت وہ
بہت ہی لالہ لالی تھا۔ لڑکیوں اور خصوصاً دیہات کی لڑکیوں کے
لیے تو ہند رہ سولہ برس کی عمر بہت بھی جاتی ہے مگر ظفر تو اس
وقت کچھ سے ذہن کا لڑکا ہی تھا جس کی سوچیں نہ جانے کس
کس سمت میں بکھری رہتی تھیں۔ پھر وہ گاؤں جاتا بھی بہت
کم تھا۔ اسے یاد تھا آخری ملاقات پر آسیہ نے بہت ہی انفرادہ
لہجے میں کہا تھا۔ ”ظفری! اب بھی اپنے اور میرے بارے میں کچھ
سوچ لو۔ کوئی وقت آئے گا کہ مجھے یاد کر کے رویا کرو گے۔“

مگر ظفر قطعی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے باپ
میں کیا سوچ لے اور نہ ہی کبھی ایسا وقت آیا تھا کہ وہ آسیہ
کو یاد کر کے رویا ہو۔ شروع شروع میں بس ایک میٹھی سی کسک
تھی۔ شہری زندگی میں دھیرے دھیرے وہ بھی دل سے محو ہو گئی تھی
آج ان قیامت خیز لمحات میں جانے کیوں وہ یاد آگئی

تھی؟ دیوار سے ٹیک لگائے لگائے اس نے یوں ایک
طویل سانس لی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہو۔ پھر اس نے جیکٹ کی
جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالتور کے ٹھوس اور سرد دستے کا
لمس محسوس کر کے اس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ اس
نے ایک بار پھر سیٹھ رفیق کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کے
ایک طرف نرس کے کمرے کا دروازہ اور دوسری طرف رئیسہ کی
خوابگاہ کا دروازہ نظر آ رہا تھا لیکن ظفر کو معلوم تھا کہ اس
وقت رئیسہ اپنی خوابگاہ میں نہیں ہوگی۔ سیٹھ رفیق خواب آور
گولیاں کھا کر سوتا تھا اور رات کے کسی بھی حصے میں رئیسہ کا
دل اپنی تنہائی سے گھبراتا تھا تو وہ چکے سے اوپر اپنے گوشہ
عافیت میں چلی جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں بھی وہ تنہا ہی ہوتی تھی
مگر جانے کیوں وہاں اس کا دل بہت لگتا تھا۔

ظفر نے سوچوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے
ہوئے گھڑی دیکھی۔ اسے احساس ہوا کہ وقت بہت تیزی سے

مورتا جاب رہا تھا۔ وہ اپنے منتخب کیے ہوئے راستے پر اب بہت آگے آچکا تھا۔ اب واپسی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے جو کچھ کرنا تھا اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کام کوئی ایسا بھی مشکل نہیں تھا۔ ساؤنڈ پروف کمرے میں ریو اور سے ایک نیم مردہ شخص پر ایک گولی ہی تو چلائی تھی۔ جوان ہونے کے بعد وہ کئی بار اپنے کالج کے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے ہی علاقے میں شکار پر جا رہا تھا جہاں انہیں سوروں سے بھی واسطہ پڑتا تھا جن کا شکار کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جان بھیلی پر رکھنی پڑتی تھی۔ ایک سؤر کو مارنے پر حکومت کی طرف سے اسی روپے بھی ملتے تھے تاہم ظفر اور اس کے دوست بیسیوں سؤر مارنے کے بعد بھی کبھی معاوضہ لینے نہیں گئے تھے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سیٹھ رفیق کے کمرے کی طرف بڑھا۔ نہایت آہستگی سے ناب گھا کر اس نے دروازہ کھولا۔ اس تالے کی ایک چابی رئیسہ کے پاس بھی ہوتی تھی۔ وہ اس تالے کو کھول گئی تھی۔ جاتے وقت ظفر کو اس پر ایسے نشانات پیدا کر کے جانا تھا جیسے 'چور' نے اسے کسی اوزار سے کھولا ہو۔

دروازہ پہلے اس نے صرف اسی قدر کھولا کہ اندر جھانک سکے۔ پُر تعیش اور طویل و عریض خوابگاہ میں ٹائٹ لیمپ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بیضوی ساخت کے بیڈ پر وسط میں سیٹھ رفیق سر سے پاؤں تک ایک ایسے کمبل میں لپٹا ہوا پڑا تھا جو اتنی کم روشنی میں اتنے فاصلے سے بھی نہایت خوبصورت محسوس ہوتا تھا۔ بیڈ کی ایک سائیڈ ٹیبل دو اوں کی شیشیوں سے بھری پڑی تھی اور دوسری دفتری فائلوں اور کتابوں سے۔ بیڈ کے سرہانے دونوں طرف خوبصورت لیمپ نصب تھے جو اس وقت بجھے ہوئے تھے۔

ایک طرف دیوار میں بہت کم بلندی پر وہ پینٹنگ بھی بھی آویزاں نظر آرہی تھی جس کے بارے میں رئیسہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے عقب میں وہ تجوری پوشیدہ ہے جو نقدی اور اہم کاغذات سے بھری رہتی ہے۔ بہت سے معاملات میں سیٹھ رفیق کو بلیک مینی سے نقد ادائیگی کرنی ہوتی تھی، اس لیے تجوری میں ہمیشہ بھاری رقم موجود رہتی تھی اور چونکہ وہ وھیل چیئر پر ہی چل کر تجوری کھولتا تھا اس لیے وہ دیوار میں بہت کم بلندی پر نصب کی گئی تھی۔ سیٹھ رفیق کو قتل کرنے کے بعد ظفر کو ایک اوزار کی مدد سے اس تجوری پر بھی ایسے نشانات ڈالنے تھے جیسے وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیٹھ رفیق کی آنکھ کھل گئی۔

کمرے کا سکوت دیکھ کر ظفر کو حوصلہ ہوا اور وہ اندر جا پہنچا۔ دروازہ اپنے عقب میں بند کر کے اس نے ایک بار پھر غیر محسوس طور پر طویل سانس لی اور ریو اور جیکٹ کی جیب سے نکال کر مضبوطی سے تھام کر بیڈ کی طرف بڑھا۔ بیڈ کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کمبل اٹھایا۔ ٹرائیگر پر اس کی انگلی کا دباؤ فیصلہ کن حد تک بڑھنے ہی والا تھا مگر اس نے بہ وقت اپنے آپ کو گولی چلانے سے باز رکھا کیونکہ جہاں اس کے خیال میں سیٹھ رفیق کی کھوپڑی ہونی چاہیے تھی وہاں اسے ایک تولیہ گولے کی سی شکل میں لپٹا ہوا نظر آرہا تھا۔

اضطراری طور پر اس نے ایک جھٹکے سے پورا کمبل دور پھینک دیا۔ اس کے نیچے دو گائیکے ایک سیدھ میں رکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ تیزی سے مڑتا اور بے اختیار چینیٹا ہوا کمرے سے نکل بھاگتا لیکن سیٹھ رفیق کی پرسکون اور میٹھی میٹھی آواز نے اسے گویا وہیں پتھر کر دیا۔

”پیچھے مڑ کر مت دیکھنا بر خوردار!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم اس وقت بے حد خطرناک ریو اور کی زد پر ہو۔ اپنا ریو اور پیچھے پھینک دو۔ مڑ کر دیکھے بغیر“

ظفر کے جسم میں اتنی بھی جان نہیں رہی تھی کہ وہ اس حکم کی تعمیل ہی کر سکتا مگر شاید وہ بے پناہ خوف کا احساس تھا جس نے مشینی انداز میں اس سے اس حکم پر عمل کروا ڈالا۔ عقب میں اسے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ غالباً ریو اور قالین پر سے اٹھایا گیا تھا۔

”اب تم میری طرف منہ کر کے آرام سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔ جب تک تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے تب تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ سیٹھ رفیق نے کہا۔

ظفر نہایت آہستگی سے گھوما اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ کمرے کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں روشنی کی رسائی بالکل ہی نہیں تھی۔ ادھر لٹکے ہوئے بھاری پردے بھی دیوار سے کافی آگے تھے اور ان پردوں کے درمیان سے سیٹھ رفیق کی وھیل چیئر آگے کو نکلی ہوئی نظر آرہی تھی جس پر وہ نہایت مطمئن انداز میں نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی ریو اور موجود تھا اور ظفر کا ریو اور قالین پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ رفیق نے اپنی وھیل چیئر میں لگا ہوا ایک ہینڈل سا گھمایا اور کچھ آگے آگیا۔

”مجھے تمہاری معصومیت اور تمہاری نوعمری دیکھ کر ترس آ رہا ہے“ وہ گہری نظروں سے ظفر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”اس مکار عورت نے کتنی آسانی سے تمہیں شیشے میں

اتار لیا... لیکن تمہیں کم از کم اتنا تو سوچنا چاہیے تھا کہ اگر میں اتنا ہی غافل، اتنا ہی احمق اور اتنا ہی آسان شکار ہوتا تو آج اس مقام پر نہ ہوتا، اتنا بڑا کاروبار نہ چلا رہا ہوتا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں دہلی کے ایک فاقہ کش گھرانے میں پیدا ہوا تھا اگر مجھے مارنا اتنا ہی آسان ہوتا تو بے رحم زمانہ یا فاقوں کا عفریت مجھے بہت پہلے مار چکا ہوتا۔“

سیٹھ رفیق کے لمحے میں برہمی تکبر یا اشتعال کے بجائے طامنت اور بزرگی تھی۔ ظفر کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اس نے تھوک نگا اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا: ”تم مجھے احمق کہو، بے وقوف کہو مگر رئیسہ کو مکاری مت کہو۔ وہ بہت دکھی عورت ہے۔ اس کے سینے میں زخموں کا الاؤ دہک رہا ہے۔“

سیٹھ رفیق کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ شاید اس نے قہقہہ لگایا تھا اور فوراً ہی اسے دبانے کی کوشش بھی کی تھی کیونکہ اس میں اُن گنت کراہیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ پھر وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا: ”وہ دکھی عورت جس کے سینے میں زخموں کا الاؤ دہک رہا ہے... اس کی آواز میں تمہیں ابھی سنو اتا ہوں۔ وہ اپنے اصل عاشق کے ساتھ اس وقت بھی اپنے اس کمرے میں موجود ہے جسے وہ اپنا خفیہ گوشہ تنہائی مانتی ہے۔“

سیٹھ رفیق نے ہینڈل گھما کر کمرے میں مجھے کو کھسکا دی اور پردے کے پیچھے ہاتھ ڈال کر نہ جانے کیا کیا کرے میں جیسے کوئی ریڈیو آن ہو گیا۔ آواز دھم تھی لیکن صاف سنی اور پہچانی جاسکتی تھی۔ وہ رئیسہ ہی کی آواز تھی۔ وہ اسی گھٹے گھٹے سے لہجے میں جس میں وہ ظفر سے باتیں کرتی تھی کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”اندر جاتے تو میں نے خود دیکھا ہے اسے۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک اسے کام ختم کر کے سگنل دے دینا چاہیے تھا۔“

”سگنل کیا مقرر کیا تھا تم نے؟“ بھاری سی آواز والے کسی مرد نے قدرے بے پروائی سے پوچھا۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ کام ختم کر کے کمرے کی عقبی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دوبار لائٹ جلا نا بھانا،“ رئیسہ کی آواز آئی۔ ”اس کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر میں رفیق کے کمرے کی عقبی کھڑکی کم از کم اس حد تک ضرور دیکھ سکتی ہوں کہ کمرے میں روشنی ہو رہی ہے یا نہیں۔“

”خیر... تم اس ہولت سے اتنی جلدی کام ختم کرنے کی توقع مت رکھو اور یہاں آ جاؤ۔ جیسا تم نے اس لوڈے کا نقشہ کھینچا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو وہ کمرے

کے دروازے پر ہی کھڑا ہو گا اور ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو گا۔ تم ابھی کچھ دیر کے لیے اس کے حال پر چھوڑو اور میرے قریب آ جاؤ۔“

”تمہیں۔ میں کھڑکی سے نہیں ہٹ سکتی۔“ رئیسہ نے مضبوط لہجے میں کہا: ”اگر میں سگنل نہ دیکھ سکی تو سارے کام میں نقص پڑ سکتا ہے۔ ہمیں اسکو عین وقت پر رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے جب ریوالور اس کے ہاتھ میں ہو اور رفیق کی کھوٹری سے ہوتا ہوا خون خشک نہ ہوا ہو... اور پھر مجھے پولیس کو آنسوؤں کی روانی کے ساتھ اپنی المناک کہانی بھی سنانی ہے اگر میں تمہارے قریب آ بیٹھی تو شاید بعد میں میری اداکاری میں وہ تاثر نہ پیدا ہو سکے جو کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔“

سیٹھ رفیق نے پردے کے پیچھے ہاتھ لے جا کر غالتھا کوئی سوئچ آف کر دیا اور آواز منقطع ہو گئی۔ اُس نے اچھا ہی کیا تھا کیونکہ ظفر میں مزید کچھ سننے کی تاب ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا جسم اندر ہی اندر یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے لرزے کا بخار چڑھنے والا ہو۔ اس کا دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا مگر سیٹھ رفیق بالکل پرسکون تھا۔

”ساتم نے؟“ سیٹھ رفیق نے قطعی مہوار لہجے میں کہا۔ ”ساتم نے قربانی کے بکرے؟ انہوں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے کوئی کہانی بھی تیار کر رکھی ہے اور وہ یقیناً بڑی بے عیب اور ناقابل تردید کہانی ہوگی قدرت نے اس کمبخت رئیسہ کو جیسا بے عیب حسن عطا کیا ہے ایسی ہی بے عیب کہانیاں وہ تخلیق کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ کہانیاں کاغذ پر نہیں لکھی جاتیں اور کہیں نہیں پھپھتیں۔ تمہیں ایک طرح سے میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے تمہیں بھانسی کے نغنے پر جانے سے بچا لیا ہے۔“

”یہ سب کیا ہے...؟“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا... کہیں میرے دماغ کی نسیں نہ پھٹ جائیں۔“ ظفر نے دونوں ہاتھوں سے سر ہٹا لیا۔

”دنیا کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے ابھی تمہارا ذہن بہت چھوٹا ہے۔“ سیٹھ رفیق نے اب ریوالور گود میں رکھ لیا اور اپنے گاؤں کی جیب سے ایک سگلا نکال کر سلگا لیا۔ ایک طویل کش لے کر اس نے کمرے میں خوشبودار دھواں بکھیرتے ہوئے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا: ”رئیسہ نے جب اپنی دانست میں چوری چھپے اور آہستہ آہستہ یہ اوپر والا کمرہ سجا نا شروع کیا تو اس کا خیال تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلے گا۔ غلط فہمی تھی اس بے چارے کو۔ اسے اندازہ نہیں کہ مجھے تو اس بات کا بھی علم ہوتا ہے

کہ کس سرفٹ کو ارٹ میں نئی چارپائی آئی ہے۔ باخبر رہنے ہی میں میری عافیت ہے کیونکہ جوں جوں انسان کی دولت بڑھتی جاتی ہے اس کے گرد خطرات کا جنگل بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ رئیسہ نے بڑی حماقت کی اگر وہ کہیں اور کرائے کا کوئی بنگلہ وغیرہ لے کر اپنا عشرت کدہ بنا لیتی تو شاید مجھے علم نہ ہوتا لیکن عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے گھر میں اپنے آپ کو ہر معاملے میں زیادہ محفوظ و مامون تصور کرتی ہے۔ بہر حال مجھے رئیسہ کے اس عشرت کدے کا پہلے دن سے پتہ ہے۔۔۔ اور پھر کافی عرصہ پہلے جب رئیسہ اپنی کسی نامعلوم بیماری کا علاج کرانے کے بہانے اور دراصل اپنے ایک عاشق کے ساتھ گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی تھی تو میں نے ایک نہایت ہی لائق الیکٹرانک انجینئر سے اس مکرے میں یہ سسٹم خفیہ طور پر نصب کروایا جس کے ذریعے تم یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ تمہیں اب شاید یہ سن کر حیرت نہ ہو کہ جس کی آواز تم سن رہے تھے یہ کوئی رئیسہ کا پہلا عاشق نہیں ہے۔ شادی کے بعد سے یہ اس کا تیسرا عاشق ہے۔ ایک نہایت پراسرار حالات میں چل بسا تھا، دوسرا نہ جانے کیوں اور کیسے اسے چھوڑ گیا۔ یہ تیسرا عاشق چھ فٹ سے بھی اونچا ایک قوی ہیکل جوان ہے مگر رئیسہ کے تھوڑے چائٹا ہے۔ تم تو اس شخص کے سامنے محض لونڈے معلوم ہو گے لیکن رئیسہ کے نزدیک وہ بھی محض ایک کھلونا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ تمہارے ہاتھوں مجھے قتل کروانے اور تمہیں پھانسی کے تختے تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی تو زیادہ عرصے اس عاشق کو بھی اپنے سر پر مستط نہ رکھتی معلوم نہیں اس کا وہ کیا حشر کرتی.... اور اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

وہ سگار کا کش لینے لگا اور کش لینے کے بعد بھی کچھ نہیں بولا۔ ظفر کی جرات کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ اس مسافر کی طرح جس کا سب کچھ ہی لٹ چکا تھا، اب وہ جیسے ہر خوف سے بے نیاز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خفگی آمیز سے لہجے میں بولا "تم یہ سب کچھ کیسے برداشت کرتے ہو؟ کیسے سنتے ہو؟ کیا یہ.... بے غیرتی نہیں؟"

اتنی دیر کی گفتگو میں پہلی بار سیٹھ رفیق مسکرایا۔ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ "بے غیرتی تو مجھ سے اسی دن سرزد ہو گئی تھی جس دن میں نے اپنے سے تیس سال چھوٹی لڑکی سے شادی کی تھی۔" وہ قدرے افسردہ سے لہجے میں بولا لیکن پھر فوراً ہی خوش دلی سے مسکرا دیا۔ "اور پھر غیرت تو ویسے بھی دراصل رگوں میں دوڑتے ہوئے لو کی گرمی کا نام ہے اور میرا خون

اب کچھ ایسا زیادہ گرم نہیں رہا۔ میرے لیے اب یہ سب دراصل شطرنج کی ایک بازی بن کر رہ گئی ہے۔ رئیسہ میری حریف کھلاڑی ہے۔ ہمارے درمیان ایک غیر مرئی بساط پر زندگی اور موت کی بازی چل رہی ہے لیکن میری ایک بات لکھ لو۔ میں اس دنیا میں رہوں یا نہ رہوں اشد مات بہر حال رئیسہ ہی کو ہوگی۔ بس یہی سوچ سوچ کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی رہتی ہے۔"

ظفر کچھ کنا چاہتا تھا مگر اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ دفعۃً سیٹھ رفیق نے جھرجھری سی لیتے ہوئے کہا۔ "بس اب تم بھاگ جاؤ ورنہ شاید کسی برے انجام سے تمہیں میں بھی نہ بچا سکوں اور رئیسہ سے آئندہ تم جتنا بھی دور رہو اتنا ہی تمہارا حق میں بہتر ہوگا۔ کوشش کرنا کہ اس سے تمہارا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور اگر ہو ہی جائے تو ایسے بن جانا جیسے تم اسے جانتے ہی نہیں، اس کی ذات سے اور اس کے عزائم سے آگاہی تو دور کی بات ہے۔ سمجھ رہے ہوتا؟"

ظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے وہ ایک ٹک سیٹھ رفیق کی طرف دیکھتا رہا پھر وحشت کے سے عالم میں اٹھا اور کمرے سے نکل بھاگا۔ وہ جلد از جلد اس گھر سے بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہتا تھا جہاں رئیسہ سے کبھی اس کا سامنا نہ ہو سکے۔ وہ اس سے خوفزدہ نہیں، شرمندہ اور نامدوم سا تھا اور یہ بڑی عجیب بات تھی۔ شرمندہ اور نامدوم تو رئیسہ کو ہونا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس وہ خود کو خجل سا محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہ اپنی محبت کے سامنے شرمندہ تھا جو بڑی حد تک بے لوث اور معصوم تھی مگر وہ اسے ایک ایسی عورت کے قدموں میں نثار کیے ہوئے تھا جس کی عیاری، مکاری، بے حسی اور سنگدلی کے سیلاب میں اس کی حیثیت محض ایک تینکے کی سی تھی۔

فی الحال اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا کہ کہاں جائے۔ ہوٹل کی ملازمت وہ رئیسہ کی ہی فرمائش پر دو ہفتے پہلے چھوڑ چکا تھا حالانکہ اپنی مرضی سے شاید وہ ایک طویل عرصے تک ایسا نہ کرتا۔ پرسنل مینجر اور رئیسہ درانی جس نے اسے یہ ملازمت اس وقت دلائی تھی جب کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا، اس کا استعفیٰ دیکھ کر چُپ سے ہو گئے تھے پھر انہوں نے بیک وقت ایک ہی بات کہی تھی۔ "شہرت کی ابتدائی منزلوں پر ہی تم نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ظفر! ہمارا خیال تھا کہ تم بہت بڑے آدمی بن جانے کے بعد بھی ہم سے ترک تعلق نہیں کرو گے۔" "میں ترک تعلق نہیں کر رہا" ظفر نے مذہم سی آوازیں کھاتھا۔ چند مصروفیات کے لیے وقت نکال رہا ہوں۔ یوں

وہ اس ٹھکانے کو چھوڑ آیا تھا جہاں اس کی صلاحیتوں کا بیج پھوٹا تھا۔

سیٹھ رفیق کی کوٹھی سے وہ یوں نکل کر بھاگا جیسے کسی اندھیرے کمرے میں چھت سے چپکی ہوئی چمکا ڈرا چانک بونی ہو جانے پر ہڑبڑا کر وہاں سے نکلی ہو۔ بہت دور جا کر اسے ایک ٹیکسی ملی۔ آج کی ریم، پر وہ اپنی گاڑی میں نہیں آیا تھا۔ اپنے فلیٹ پر پہنچ کر وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح بستر پر گر پڑا۔ وہ جاگ رہا تھا مگر اس کے حواس سوچکے تھے یا شاید سُن ہو گئے تھے۔

اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ سورج کب طلوع ہوا، کب صبح ہو گئی اور کب نیچے ٹرک پر ٹریفک کے شور میں وہی روزمرہ کی سی روانی آگئی۔ کھڑکی کے شیشوں کو پار کر کے آنے والی دھوپ جب اس کی آنکھوں میں زیادہ ہی چبھنے لگی تو وہ برسوں کے مریضوں کی طرح اٹھا اور اپنے آپ کو گھسیٹے ہوئے بالکونی میں پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔

اس کا خیال تھا کہ اس پر جو صدمہ گزرا ہے وہ اس قدر جانکاہ اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے بعد سورج طلوع نہیں ہو سکے گا۔ دنیا کی گردش ختم جائے گی اور کاروبار حیات معطل ہو جائے گا۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سورج نصف النہا پر پہنچنے کے قریب تھا۔ گاڑیوں کا سیلاب روز کی طرح ڈال تھا۔ لوگ کاروبار حیات میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ دینے کے لیے عجب افراتفری کے عالم میں دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو گمان تک نہیں تھا کہ اوپر بالکونی میں مصمحل چہرہ لیے جو نوجوان ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے بیٹھا ہے اس پر کیا قیامت بیت چکی ہے، اس کے اعصاب کیسے شل ہیں اور اس کے اعتبار کا اثاثہ کس بیدردی سے ٹوٹا گیا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کی توانائی بحال ہونے لگی مگر اب بھی وہ اتنی ہمت محسوس نہیں کر رہا تھا کہ نیچے جا کر لیٹوان سے ناشتہ کرے۔ دفعۃً کسی نے اس طرح کال بیل بجائی جس طرح بٹن پر انگلی رکھ کر بٹنا بھول گیا ہو۔ ظفر سم سا گیا کئی لمحے تک وہ ساکت بیٹھا رہا مگر جب گھنٹی کی آواز بند نہ ہوئی تو اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ گھنٹی بجانے والا امتیاز علی تھا۔

امتیاز علی درمیانے قد کا ایک سالو لاسا نوجوان تھا جو ہر ایک سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ ٹی وی پر اسسٹنٹ پڑ پوسر تھا اور ظفر نے جب نیا تایا کا

شروع کیا تھا تبھی ان میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ بعد میں امتیاز لاہور چلا گیا۔ ظفر نے سنا تھا کہ وہاں اس نے مشہور فلمی ہیر وٹن ندرین کے فلم ساز ادارے میں بطور پروڈکشن منیجر ملازمت کر لی تھی۔ بطور ہیر وٹن تو ندرین کی شہرت کے قلاب کو گرہن لگنے لگا تھا لیکن بطور فلم ساز اور ہدایت کار اس نے شہرت اور عروج کی دنیا میں گویا نیا جنم لے لیا تھا۔ یکے بعد دیگرے باکس آفس پر اس کی تین فلمیں ہٹ ہوئیں تھیں اور اب اس کا شمار بڑے فلم سازوں اور معروف ترین ہدایت کاروں میں ہوتا تھا۔ فلموں میں اداکاری اس نے خود ہی بہت کم کر دی تھی۔

امتیاز اسے ایک طرف کو دھکیل کر اندر آتے ہوئے بولا ”میں تو سمجھتا تھا صرف گھڑی میں بارہ بجے ہیں لیکن یہاں تو تمہاری شکل پر بھی بارہ بج رہے ہیں“ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا ”کچھ کھانے کو ہے؟ اپنی تو زندگی اتنی مصروف گزر رہی ہے کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن میرا خیال ہے تمہارے ہاں کھانے پکانے کا بندوبست نہیں ہے۔ اس لیے چھوڑو اس ذکر کو۔ بیٹھ کر کام کی بات کرتے ہیں“

وہ آرام سے ڈرائنگ روم میں صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ظفر بالکل خاموش تھا لیکن امتیاز کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسی قسم کا آدمی تھا کہ اپنی دھن میں، جوش و خروش میں اپنی ہی ہانکے جاتا تھا اور دوسرے کے بولنے کا انتظار نہیں کرتا تھا۔

”میں اپنے یونٹ کے ساتھ پرسوں ہی کراچی آیا ہوں“ وہ گویا اب اصل بات شروع کرتے ہوئے بولا ”تمہیں شاید معلوم ہو کہ ہماری تازہ فلم دیوانے، کی کچھ شوٹنگ کراچی میں ہو رہی ہے۔ تقریباً مہینہ ڈیڑھ مہینہ یہاں مختلف مقامات پر شوٹنگ ہو گی۔ میڈم نورین بھی آئی ہوئی ہیں۔ میں تمہارے لیے یہ خوشخبری لے کر آیا ہوں کہ میڈم کو تمہاری آواز بے انتہا پسند ہے اور انہوں نے کب سے ارادہ کیا ہوا تھا کہ ان کی نئی فلم میں کم از کم دو گانے تم گاؤ گے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تمہیں اس کام کے لیے لاہور نہیں بلانا پڑا۔ گانے رکھے ہوئے رکھے ہیں۔ دھنیں یہیں کے اسٹوڈیو میں تیار ہو چکی ہیں۔ بس آج چل کر تم ریہرسل کر لو۔ کل صبح ہی صبح ریکارڈ کر لیں گے کرنے کو تو آج بھی ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ ریکارڈنگ روم میں ہماری شفٹ بک ہے لیکن میڈم تمہیں ریہرسل کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان

گانوں سے تم پلک کوڑلا دو۔ دونوں گانے المیہ میں۔ غضب کی شاعری ہے اور غضب کی دھنیں بنی ہیں۔۔۔ چلو اٹھو۔ پکڑے بدل لو اور اپنا ایک سیلینگ ٹوٹ اور ٹوٹتے برش بریف کیس میں ڈال لو۔ شاید آج کی رات تمہیں ہمارے ساتھ ہی گزارنی پڑ جائے۔“

ظفر اب بھی اس کے سامنے خاموش بیٹھا مگر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ امتیاز اٹھ کر اس کے قریب آیا اور مضبوطی سے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا ”اب اٹھ بھی چکو۔ کیا دیو داس جیسی شکل بنا رکھی ہے میں نے تمہیں المیہ گانوں کی تیاری کرنے کے لیے کہا ہے، المیہ سین پچر انز کرنے کے لیے نہیں کہا۔“



نورین ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈی لکس سوٹ میں ٹھہری ہوئی تھی اور اس روز شوٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے وہیں موجود تھی۔ اس کے دائیں بائیں اس کا سیکرٹری، پرائیویٹ میک اپ مین، ایک ملازم، ایک ڈسٹری بیوٹر، ایک فلم ساز دو تین اور آدمی جو صورت سے صرف چمچے معلوم ہوتے تھے اور جھریوں بھرے چہرے والی ایک سیاہ فام عورت جس کے بارے میں صحیح طور پر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ نورین کی کیا گھتی ہے، موجود تھی۔ اس عورت کو کوئی نورین کی ماں کہتا تھا اور کوئی نانی۔ سنسنے میں آیا تھا کہ خود نورین اس کے بارے میں صحیح طور پر کبھی کچھ نہیں بتاتی تھی، مال جاتی تھی تاہم وہ عورت گھر، بازار، اسٹوڈیو وغیرہ ہر جگہ نورین کے ساتھ سارے کی طرح موجود ہوتی تھی۔

کمرے میں جے جہاں بیٹھے کو جگہ میسر تھی بیٹھا تھا۔ ایک آدھ آدمی تو کھڑا بھی تھا اور وسط میں نورین بنی سنوری ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح بیٹھی تھی جیسے کوئی ملکہ غیر رسمی دربار سے مخاطب ہو۔ وہ خاموش ہوتی تھی تو سب بیک وقت زور شور سے بولنا شروع کر دیتے تھے اور ایک عجیب ہنگامہ سا برپا ہو جاتا تھا لیکن وہ بولنے لگتی تھی تو سب اپنی اپنی بات ادھوی چھوڑ کر خاموش ہو جاتے تھے۔

پروڈکشن مینجر امتیاز نے جب آگے بڑھ کر نورین کو بتایا کہ وہ گلوکار ظفر احمد کو لے آیا ہے تو ظفر کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی ”آئیے۔۔۔ آئیے ظفر صاحب! آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا!“ اس نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔ اس نے اچانک ہی جیسے کمرے میں موجود تمام افراد کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کا اشارہ پا کر ایک

شخص نے کرسی چھوڑ دی اور نورین نے ظفر کو اس پر آ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ظفر کے بیٹھتے ہی نورین نے سب لوگوں کو اجتماعی طور پر مخاطب کیا ”بھئی آپ سب لوگوں کو مجھ سے جو جو کام تھے ان کے بارے میں میں نے آپ کو جو جواب دینا تھا دے دیا۔ اب براہ کرم مجھے کچھ اپنا کام کرنے کا موقع بھی عنایت فرمائیں، میری اپنی فلم کی شوٹنگ آج بھی کیسل ہو گئی ہے۔“

سب لوگ ذرا بھی براہ منائے بغیر خاکسارانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے رخصت ہو گئے حتیٰ کہ نورین کے اپنے آدمی بھی کمرے سے باہر چلے گئے۔ سیاہ فام عورت نے بھی اپنا خوبصورت سامنٹش پانڈا اٹھایا اور سوٹ کے اندرونی حصے جو خوابگاہ وغیرہ پر مشتمل تھا، میں چلی گئی۔ تب نورین نے گویا سکھ کی سانس لی اور صوفے کے پشے سے سڑکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے وہ انگلیوں سے کپٹیاں مسلتی رہی۔ اس دوران ظفر خاموش بیٹھا اس کا جائزہ لیتا رہا۔

اس کا قد درمیانہ، رنگت گندمی، جسم گدرا یا ہوا اور نین نقش دلکش تھے۔ اس کی ناک چینی لڑکیوں کی طرح کچھ بیٹھی بیٹھی سی تھی اور اسے شروع شروع میں فلمی دنیا میں اس کے چہرے کا ایک نقص سمجھا گیا تھا مگر بعد میں فلم سازوں نے دیکھا کہ دنیا اس کی اس ناک پر ہی مرمی۔ جس شرارت بھرے انداز میں وہ مختلف فلمی مناظر میں یہ ناک سیکڑتی تھی اس سے سینما ہال میں، خصوصاً تھرڈ کلاس میں بڑکیں گونجنے لگتی تھیں اور اب یہی ناک تھی جس پر وہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔

ظفر کئی اداکاروں کو دیکھ چکا تھا، کئی سے مل چکا تھا لیکن یہ پہلی اداکارہ تھی جو اسے اسکرین سے زیادہ حقیقی زندگی میں دلکش لگی تھی گو کہ اس وقت بھی اس نے فلمی انداز کا ہی بہت گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ ظفر کا خیال تھا کہ اگر وہ ہلکا میک اپ کرتی تو اس سے بھی زیادہ دلکش نظر آتی۔

یہاں تک پہنچنے سے پہلے ظفر، امتیاز کے ساتھ خاصا وقت گزار چکا تھا اور بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی مل چکا تھا اس لیے اس کی پڑمردگی اور دل شکستگی کے اثرات کافی حد تک کم ہو چکے تھے۔ کاروان محبت لٹ جانے کا صدمہ کم از کم وقتی طور پر ذہن سے ضرور محو ہو چکا تھا اور وہ اس ہرجائی او ہلا صفت عورت رئیسہ کا تصور ذہن سے جھٹک کر دنیا کی دلکشی کو ازبر نو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امتیاز کا اس کے گھر آ جانا اس کے لیے گویا حیات نو کا پیغام ثابت ہوا تھا ورنہ شاید وہ غم سے اس قدر مغلوب ہو جاتا کہ کوئی بیماری اسے

اُن گھرتی اور وہ بستر سے ہی لگ جاتا۔

نورین آنکھیں کھول کر مسکراتی: ”کیسے کیسے بور لوگوں سے دن بھر سر کھپانا پڑتا ہے؟“ وہ تھکے تھکے سے ہنسنے میں بولی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اداکاروں کی زندگی بڑی گلیمرس اور پُر آسائش ہوتی ہے۔۔۔ کتنا مہنگا پڑتا ہے یہ گلیمر اور یہ آسائش۔۔۔ آپ اتنے خاموش خاموش کیوں ہیں مسٹر ظفر؟ کچھ بولیے نا!“

”آپ بولتی رہتیے مجھے سننا ہی بھلا معلوم ہو رہا ہے؟“ ظفر نے مذہم لہجے میں کہا۔

”بہت خوب۔۔۔ اس بالواسطہ تعریف کا شکریہ“ نورین کی مترنم سی ہنسی کمرے میں گونجی۔ ”میرا اندازہ دست ہی تھا کہ آپ بڑے شائستہ اور مذہم لہجے میں گفتگو کرتے ہوں گے اور اگر آپ اسے جوابی تعریف نہ سمجھیں تو میں کہوں گی کہ آپ کو تو گلوکار کے بجائے ہیر و ہونا چاہیے تھا۔ شخصیت کے اعتبار سے آپ ہمارے فلمی ہیروز سے تو بدرجہا بہتر ہیں۔ ٹی وی کی اسکرین پر تو گویا آپ کی شخصیت کا سارا اثر ہی سکرٹسٹ جاتا ہے۔ لیکن آپ یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی تعریف کر کے میں گانوں کا معاوضہ تم کرانے کی کوشش کروں گی۔ شو بزنس کی دنیا میں عموماً تعریف کا یہی مطلب لیا جاتا ہے؟“

”معاوضے وغیرہ سے مجھے کبھی اتنی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ میں تو شخصیات اور اداکاروں کو دیکھتا ہوں؟“ ظفر دھیمی لہجے میں بولا۔ ”اگر میں کاروباری ذہنیت کا مالک ہوتا تو کب کا خود ہی فلمی دنیا میں آچکا ہوتا۔۔۔ آپ نے عزت سے بلالیا تو آگیا ورنہ ابھی اور نہ جلتے کتنا عرصہ فلمی دنیا سے لا تعلق رہ کر ہی گزر جاتا۔ آپ کے لیے کام کر کے اس لیے بھی زیادہ خوشی ہوگی کہ آپ میری پسندیدہ ہیروئن ہیں اور میں اردو فلموں میں کم از کم آپ کی فلم مزید دیکھ لیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ فلم بہت اچھی ہوتی ہے یا میں آپ کی اداکاری اور ہدایت کاری سے بہت متاثر ہوں۔ صاف گوئی صاف، ایسی کوئی بات نہیں میں ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہوں جو صرف جسم کے لہریے اور مصنوعی ادائیں دیکھ کر مرتٹتے ہیں؟“

”تو پھر کیا بات ہے مسٹر ظفر؟“ نورین اپنی انگلیوں پٹھوی لٹکتے ہوئے قدرے آگے جھکتے ہوئے دلچسپی سے بولی۔

”بات یہ ہے۔۔۔“ ظفر نے نظریں جھکا کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا: ”کہ جب میں چھوٹا تھا تو ہمارے گاؤں میں ہر سال لگنے والا میلہ صرف ایک بار دیکھنے گیا تھا۔ اس وقت یہی کوئی دس گیارہ برس کی عمر ہوگی میری۔ میلے میں ایک تھیٹر کمپنی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کے ٹینٹ کے باہر اونچے

تختے پر جہاں مسخرے اور میجرے ناچتے تھے اور ٹکٹیں فروخت ہوتی تھیں، وہیں دہلی پتلی سانولی سی ایک نوخیز لڑکی بھی بڑی سنجیدگی سے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی عمر غالباً بارہ تیرہ برس ہوگی۔ کبھی کبھی جب میجرے اور مسخرے اچھلتے کودتے تھک جاتے تھے تو اس لڑکی کو ناچنے پر لگا دیا جاتا تھا اور تھیٹر پر ہجوم بڑھنے لگ جاتا تھا۔ غضب کا ناچتی تھی وہ۔ لیکن مجھے وہ ناچتی ہوئی نہیں بلکہ ہاتھوں کے طعنے میں چہرہ دکانے سنجیدگی سے بیٹھی ہوئی اچھی لگتی تھی۔ اس کی ناک صینی لڑکیوں کی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور جب وہ مسکراتی تھی تو اس ناک پر شکنیں پڑ جاتی تھیں۔ اس عالم میں تو وہ مجھے بہت ہی پیاری لگتی تھی۔ میں کم عمر تھا، اپنے جذبے کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا لیکن اب میرا خیال ہے کہ وہ میرے معصوم لڑکپن کی اولین محبت تھی۔ اس کی صورت میری آنکھوں میں اس وقت بھی پھرتی رہتی تھی جب وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی میں اسے دیکھنے روز جاتا تھا اور جب وہ ہجوم زیادہ ہوتا تھا تو اسے قریب سے دیکھنے کے لیے نہ جانے کیا کیا جتن کرتا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس کم عمری میں مجھے وہ سپنوں میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ اگلے سال میلہ لگا تو میں شہر آچکا تھا اور ہوسٹل میں تھا مگر میلے کی خبر سن کر گاؤں دوڑا گیا۔ وہاں کوئی اور تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ اس میں دوسری لڑکیاں تھیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آگیا۔ میں بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی میں آپ کی بڑی مشابہت تھی۔ وہ آپ کا لڑکپن نظر آتی تھی۔ مرجھایا ہوا سا لڑکپن۔ گو کہ وہ اس کی چڑھتی عمر تھی مگر اس میں وہ تازگی اور شگفتگی نہیں تھی جو آپ کی شخصیت کا سب سے اہم حصہ ہے؟“ اور اس بات پر خود ظفر کو بھی حیرت تھی کیونکہ نورین کئی سال سے فلمی دنیا کے اعصاب شکن ماحول میں کام کر رہی تھی، دو شادیاں کر کے طلاقیں لے چکی تھی اور اب بھی بے پناہ مصروف زندگی گزار رہی تھی مگر حقیقی زندگی میں وہ اسکرین سے زیادہ شگفتہ دکھائی دیتی تھی۔

ظفر نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور سلسلہ کلام جاری رکھا: ”میں نے جب پہلی مرتبہ آپ کی ایک فلم دیکھی تو لڑکپن کا وہ بھولا بسرا اور دھندلا دھندلا سا خواب ذہن میں تازہ ہو گیا۔۔۔ اور میں آپ کی ہر فلم دیکھنے لگا۔ بس اتنی سی بات ہے؟“ وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرایا پھر یہ دیکھ کر اس کی سکرابٹ معدوم ہو گئی کہ نورین ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میک اپ کی گہری تہوں کے باوجود محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس کی زنگت زرد سی پڑ گئی تھی چند لمحے بعد وہ جیسے تنویری کیفیت سے چونکی اور ایک

پہلی سی مسکراہٹ اس کے تراشیدہ سے ہونٹوں پر لگی آئی۔ وہ مدغم آواز میں بولی: ”آپ چونکہ صحافی نہیں ہیں سٹر ظفر اور پیٹ کے ہلکے بھی معلوم نہیں ہوتے اس لیے میں آپکو بتا دوں کہ میں وہی لڑکی ہوں“

ظفر ایک ٹمک اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ وہ صرف بے معنی سے انداز میں ہنس بیا۔ نورین سرسراقتی ہوئی سی آواز میں بولی: ”میں مذاق نہیں کرہی... سولہ برس کی عمر تک میں نے گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے تھیر پھینوں میں مداری کی بندریا کی طرح ناتج دکھایا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر سے دھیرے دھیرے شہرت و دولت نے مجھے اپنے سائے میں لینا شروع کیا اور نہ اس سے پہلے میں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ میں لڑکی تھی۔ زیادہ خوبصورت نہیں تھی تو بد شکل بھی نہیں تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں چھوٹے موٹے مفادات کے لیے بھی بکنے کے لیے تیار رہتی تھی، ایک گھاگ اور گرگ باراں دیدہ قسم کی عورت میری نگران اور سرپرست بھی تھی مگر پھر بھی میں کچھ حاصل نہ کر سکی۔ گنوا تھی رہی اور جب میں نے مایوس ہو کر جدوجہد ترک کر دی تو سب کچھ دھیرے دھیرے میری جھولی میں آنے لگا، ایک لمحے کے توقف سے وہ تجسس سے ہلچے میں بولی۔

”دیے سٹر ظفر! کیا واقعی تھیر کے دروازے پر ناچنے والی وہ لڑکی آپ کو بہت اچھی لگتی تھی؟“

”وہ اب بھی میرے دل کے کسی گوشے میں رہتی ہے۔ ایک سیٹھی کسک کی طرح“ ظفر نے جواب دیا۔ نورین نے جھرجھری سی لی پھر یک نخت جیسے گہرا موضوع بدلتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی: ”میرا خیال ہے اب ہم اس کام کی بات بھی کر لیں جس کے لیے میں نے آپ کو بلوایا تھا! اس نے ٹیلیفون اٹھا کر آپریٹر کے توسط سے کوئی نمبر ملایا اور ٹھہری ٹھہری پرسکون آواز میں کہا: ”اقبال صاحب سے کہیے کہ ایک کنٹریکٹ فارم لے کر آجائیں اور ظفر احمد صاحب سے سائن کروائیں“



ظفر آیا تو تھا نورین کی فلم کے لیے صرف دو گانے گانے کے لیے جو زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام تھا مگر ہوا یہ کہ نورین نے اسے روز بلانا شروع کر دیا۔ کبھی اگلی فلم کے گانوں کے بارے میں تبادلہ خیال ہو رہا ہے تو کبھی سچو نیشنز دس ہو رہی ہیں بلکہ نورین اسے قائل کرنے لگی تھی کہ اداکاری بھی شروع کرنی چاہیے جس کے لیے وہ رضامند نہیں ہو رہا تھا اس

نے صرف اتنا ہی کہا تھا: ”نورین صاحبہ...“

”خدا ایک لمحے ظفر اب تو یہ صاحبہ والا دم چھٹا ہٹا دو۔ اتنے دن ہو گئے ہیں ہمیں ملتے ملتے ہوئے۔ ایک خاص تعلق خاطر دریافت ہو چکا ہے ہمارے درمیان۔ کیا اب بھی صرف نورین کہنے سے کام نہیں چلتا؟“

”اچھا... تو میں یہ کہہ رہا تھا نورین کہ میں سچا اور کھرا آدمی ہوں“ ظفر بولا: ”اداکاری میرے بس کی بات نہیں۔ ٹی پر گانوں کے دوران جو تھوڑی بہت اداکاری کر لیتا ہوں یہی کافی ہے“

”لیکن میں تم سے اداکاری کروا کے چھوڑ دوں گی“ نورین سینے پر ہاتھ مار کر بولی تھی: ”میں نے ہمیشہ نئے چہرے متعارف کرانے کا رسک لیا ہے۔ تمہیں بھی متعارف کراؤں گی اور تم دیکھو گے کہ لوگ تمہارے پیچھے ہوں گے“

”جوتے ہاتھوں میں لیے؟“ ظفر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”نہیں محبتوں کے پھول لیے؟ نورین نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

حد تو یہ تھی کہ نورین اس سے اگلی فلموں کی زیر غور کہانیوں تک پر تبادلہ خیال کرنے لگی تھی۔ حالانکہ لکھنے لکھانے سے ظفر کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور کہانی کی فلمی قدر و قیمت کو جاننے کا بھی اسے کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ نورین کا یہ اصرار بھی جاری تھا کہ ظفر کو شوٹنگ کے اختتام پر ہر حال میں ان کے ساتھ ہی لاہور چلنا ہو گا۔ موجودہ فلم کے لیے بھی اس نے ایک اور گانا ظفر سے گویا تھا اور تینوں گانوں کا معاوضہ ظفر کو تمام بڑے گلوکاروں کے برابر ادا کیا گیا تھا۔ نورین کا کہنا تھا کہ ظفر نے اس فلم کے لیے جو پہلا گانا گایا تھا اسے راتوں کو کیٹ پلیئر پرسن سن کر وہ روتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ قبول اس کے اپنے ہی، فلمی لوگوں کو المیہ گانوں پر شاذ و نادر ہی رونا آتا تھا۔

ایک روز باتوں باتوں میں ظفر نے یونہی سرسری انداز میں ذکر کر دیا کہ اگلا دن اس کی سالگرہ کا دن ہے مگر سالگرہ بچپن سے لے کر اب تک اس نے کبھی منائی نہیں تھی۔ کبھی دل ہی نہیں چاہا تھا اور اس کا باپ تو ویسے ہی ایسی رسوم کے خلاف تھا۔

دوسرے روز وہ حسب پر وگرام نورین کے سوٹ میں پہنچا تو اس نے سرخ کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا لمبو تراپیٹ اس کی طرف بڑھا دیا جس پر ”ہیپی برتھ ڈے“ کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ ظفر کو زندگی میں پہلی بار کسی نے سالگرہ کا تحفہ دیا تھا۔ اسے

ایک عجیب دھیمی دھیمی سی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس نے وہیں پکیٹ کھول کر دیکھا۔ ان دنوں اونچے طبقے کے نوجوانوں میں اصلی یا نقلی سونے کا لاکٹ پہننے کا رواج شروع ہو رہا تھا۔ وہ ایک نہایت خوبصورت ڈیزائن کا طلائی لاکٹ تھا۔ ظفر کے اندازے کے مطابق اس کی قیمت چھ سات ہزار روپے سے کم نہیں رہی ہوگی۔

اس کے لیے اب اندازہ کرنا مشکل نہیں رہا تھا کہ دلوں میں کونسی چنگاری تاؤ پڑ رہی تھی، کونسی غلش جاگ رہی تھی اور خیالوں کے ویران صم خانوں میں کوئی انجانا سا ہاتھ کیسی کیسی مورتیاں سجانے لگا تھا۔ نورین کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ستارے کیوں جھلما اٹھتے تھے اور وہ خود اس سے ملنے جانے کے لیے خاص طور پر اہتمام سکیوں کرتا تھا۔ ان سب سوالوں کا جواب پا کر اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی مگر پھر ریمہ کے دیے ہوئے زخم میں ٹیس جاگ اٹھتی تھی۔ ابھی تو وہ زخم صحیح طور پر بھرا ہی نہیں تھا کہ دل پر اس نئی ہستی نے دستک دینی شروع کر دی تھی۔ اس کی ذات کی جھیل تو ریمہ سے بھی زیادہ گہری تھی۔ وہ کیسے اس کی تہہ کو پاسکتا تھا؟ کیا وہ واقعی اس سے محبت کرنے لگی تھی؟ کہیں ایک نیاز ختم تو اس کا منتظر نہیں تھا؟ اس آخری سوال پر ظفر کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ لیکن اس احساس کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے کہ کوئی آپ سے محبت کرتا ہے۔ انسان خود بخود ہی کھنچا چلا جاتا ہے۔ وہ بھی کھنچا چلا جا رہا تھا اور نورین کی اس ایک بات نے اس کے سینے میں ایک عجیب تلاطم سا برپا کر دیا تھا جب ظفر نے لاکٹ دیکھ کر کہا تھا۔ "نورین! تم نے یہ کھٹک کیوں کیا؟"

"یہ نورین کی طرف سے نہیں ہے" وہ مدھم سی آواز میں بولی اور ظفر کو اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلک سی محسوس ہوئی۔ یہ اس غریب اور نادار لڑکی کی طرف سے ہے جو بارہ تیرہ برس کی عمر میں بھیتڑے پھٹے پرنا چا کرتی تھی۔ پھر بھی اسے دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نہیں، تھپڑ اور لاتیں نصیب ہوا کرتی تھیں۔ وہی لڑکی جسے تم دور کھڑے دیکھا کرتے تھے مگر اسے علم نہیں تھا۔ اس لڑکی نے آج اور تو سب کچھ پایا ہے لیکن محبت کی تلاش میں اس کی روح اب تک بھٹک رہی ہے۔ ظفر کا دل خزاں رسیدہ ہونے کی طرح کانپنے لگا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ نورین کو سینے سے لگائے اور اسے ان آنسوؤں کا غبار نکال لینے کا موقع دے جو پلکوں کی دہلیز پار نہیں کر پاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی جی بھر کے روئے۔ اسے

بتائے کہ وہ بھی انسانوں کے ہجوم میں رہتے ہوئے کس قدر تنہا ہے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ نورین تیزی سے مڑی اور بیڈروم میں چلی گئی جہاں سے اس پر اسرار سی سیاہ نام ٹوٹ کے سر واپلائے کی کٹ کٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس روز وہ شوٹنگ پر نورین اور دیگر تمام لوگوں کے ساتھ کلفٹن پر گیا مگر کھویا کھویا سا رہا۔ نورین بھی ہدایتکاری کی ذمہ داریاں انجام دیتی رہی مگر بار بار اس کا ذہن جیسے کہیں اڑ بیچ جاتا تھا۔ زیادہ تر کام اس کے اسٹنٹ نے ہی سنبھالا۔

اندازاً صرف چند دن کی شوٹنگ اور رہ گئی تھی جو ٹیڈل سے آگے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد یونٹ کو واپس لاہور جانا تھا۔ ایک روز ظفر شوٹنگ کے بعد نورین کو اس کے کمرے تک پہنچا کر رخصت ہونے لگا تو نورین نے اس کا ہاتھ دبا تے ہوئے سرگوشی میں کہا "کل شوٹنگ کا ناغہ ہے۔ تم دوپہر کے بعد آنا جب بے جی سوئی ہوئی ہوں گی۔ مجھے تم سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں"

ظفر تیزی سے دھڑکتا دل لیے گھر واپس آیا۔ اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ باتیں کیا ہوں گی اور وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مایوس نہیں کرے گا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی یہی کیا کم تھا۔ محبت کی تو اک نظر کے بدلے وہ خاک راہ کی طرح اس کی راہ میں کچھ جانے کو تیار تھا۔ یہی تو کمبخت وہ جنس گراں مایہ تھی جس کی پیاس سے اسے سب ہی دیوانے نظر آتے تھے اور خوش قسمت تھا وہ جسے یہ نصیب تھی۔

دوسرے روز وہ ہوٹل پہنچا تو راہداری میں رک کر اس نے غیر ارادی طور پر گھڑی دیکھی اور اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے اشتیاق اور ہیجان کی رو میں کچھ جلدی ہی آگیا ہے۔ ابھی بے جی کے سونے کا وقت نہیں ہوا تھا مگر تب تک تو وہ سوٹ کے ڈرائے پر پہنچ چکا تھا اور الجھن میں پڑ چکا تھا کہ دستک دے یا کچھ دیر نیچے لابی میں بیٹھ کر انتظار کر لے۔ نورین شاید آج اس کی آمد کو بے جی سے مخفی رکھنا چاہتی تھی۔

وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اندر خاصی تیز تیز آوازیں ہیں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کے کانوں تک تو آوازیں بہت ہی مدھم پہنچ رہی تھیں اور جب تک کان لگا کر نہ سنا جاتا الفاظ سمجھ میں نہیں آسکتے تھے لیکن اگر ساؤنڈ پروف اور کافی کشادہ سوٹ سے آوازیں اس حد تک بھی سنی جاسکتی تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اندر خاصی گرمی ہو رہی ہے۔

”بے جی اتہاری تو ساری عمر کوٹھے پر گاہکوں کو پان کھلاتے گزر گئی؟ نورین کہہ رہی تھی۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ عورت کو بہر حال ایک اچھے شوہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے تو چاہے کتنے ہی مرد عورت کی زندگی میں آتے اور جاتے رہیں لیکن شوہر کی ضرورت بہر حال اس کی مٹی میں رچی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے تو میں اس بھولے بھالے سے نوجوان کو بھانسنے لگی ہوں۔ تم اب اسے بھی بھگا دو گی۔“

”مجھے تمہارے بیاہ پر یا گھر بسانے پر اعتراض نہیں“

بے جی کی کرخت آواز سنائی دی۔ ”میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تمہیں بھانسنے کا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ایک سے ایک بڑھ کر حیثیت والا آدمی خود تمہارے ایک اشارے پر قدموں میں ڈھیر ہونے کو تیار ہے۔ بھانسا ہی ہے تو کسی جاگیردار کو قدموں پر جھکاؤ۔ اس کنگلے سنگری کی جو رو بن کر تمہیں کیا ملے گا۔ فائدہ تمہیں نہیں، اسی کو ہوگا۔“

”اسی لیے تو وہ ساری عمر جھک کر میرے ساتھ گزرا گا؟ نورین بولی۔“ ایک کروڑ پتی اور جاگیردار سے تو شادی کر کے دیکھ لی۔ کیا پھل پایا ہے جس کے پاس صحتی زیادہ دولت ہوتی ہے اتنا ہی وہ چالاک ہوتا ہے۔ جس کے پاس ہم سے زیادہ دولت ہوگی وہ ہم سے زیادہ چالاک ہوگا لہذا ہم اسے نہیں کہہ ہمیں بھانسنے رہا ہوتا ہے اور جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا شوق پورا ہو گیا ہے تو ہماری تمام تر چالاک کی باوجود ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتا ہے۔ زیادہ جان بھنستی دیکھتا ہے تو ایک آدھ فیکٹری یا دو چار مربع زمین دے کر جان چھڑا لیتا ہے۔ نتیجہ بہر حال وہی علیحدگی ہے اور مجھے اب علیحدگی نہیں کسی کا ساتھ چاہیے۔ ظفر بہت سیدھا، بہت معصوم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عمر بھر میری انگلی پچھلے پچھلے میرے ساتھ چلے گا اگر تم نے اس مرتبہ اس معاملے میں کوئی بد معاشی دکھائی کی کوشش کی تو میں تم سے بھی نیٹ لوں گی بے جی؟

ظفر نے مزید کچھ نہیں سنا اور دروازے سے ہٹ کر لفٹ کی طرف چل دیا۔ اس کا دل کسی زخمی چڑیا کی طرح ہانپ رہا تھا۔ یہ عورتیں جن سے محبت کی جاتی ہے پیٹھ پیچھے ایسی عجیب عجیب باتیں کیوں کرتی ہیں؟ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی صدمے سے دوچار تھا جس سے اسے ریشہ نے روشناس کرایا تھا۔ وہی اندر کی توڑ پھوڑ۔ وہی انا کی پامالی۔ وہی معصوم محبت پر کچھ کے بازی۔

و تو گویا نورین مجھ سے محبت نہیں کر رہی تھی مجھے بھانسنے ہی تھی؟ ظفر نے سوچا اور یہ لفظ بھانسنے، گویا بھانسنے کی طرح

اس کے دل میں اٹک گیا تھا۔ اس زمانہ ساز عورت کو تو صرف ایک سعادت مند شوہر کی تلاش تھی جو اس کی انگلی تھام کر زندگی بھر اس کے ساتھ چل سکے اور کچھ نہیں۔ اور کس غیر جذباتی انداز میں وہ ظفر کا ذکر کر رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی محبت کرنے والا انسان نہیں بازار میں رکھا ہوا مال ہو جس کی خوبیوں اور خامیوں پر تکرار کی جا رہی ہو۔ اس کی محبت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی!

گزرے دنوں کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا اور اسے اندر ہی اندر رل رہا تھا۔ وہ کونے کھدروں میں مختصر سی سرگوشیاں۔ وہ گرم وگداز ہاتھ کا معنی خیز دباؤ۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہونے والی باتیں۔ وہ کبھی کبھی سب کے ہوتے ہوئے بھی سب کی توجہ سے بچ کر کچھ کہہ جانا۔ کبھی کبھی ماضی کا کوئی یاس زدہ تذکرہ۔ وہ بے پناہ سنجیدہ موقعوں پر بھی ہنسون کے گوشوں سے پھوٹ پڑنے والا تبسم۔ اور وہ بے پناہ خوشی کے موقعوں پر بھی آنکھوں میں چھلک آنے والی نمی۔ یہ سب کچھ جھوٹ تھا؟ طے شدہ تھا؟ کسی اسکرین پلے کی طرح۔ کسی کہانی کی طرح۔ یہ سب ڈرامے کی جزویات تھیں جو اسے پھانسنے کے لیے لکھا جا رہا تھا۔

اسے پھانسنے جانے پر بھی کوئی اتنا زیادہ دکھ نہیں تھا۔ اسے نورین کے ماضی کی بھی کوئی زیادہ پروا نہیں تھی اور اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ دوسرے کی طلاق یافتہ تھی اس کے لیے تو یہ صدمہ جاں کا تھا کہ نورین کا اس کی طرف جھکاؤ جذبات سے خالی تھا، کسی فطری پیکار کی پیداوار نہیں بلکہ محض ایک ضرورت تھا۔ صابن کی طرح۔ پانی کی طرح۔ تو یہی کی طرح۔ وہ بس دنیا کے بازار میں پائی جانے والی ضرورت کی ایک چیز تھا۔

نیچے آکر وہ ریسٹوران میں بیٹھ گیا اور اس نے اپنے لیے بلیک کافی کا آرڈر دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا اور کبھی آنسوؤں کی دھند لاہٹ پھیل رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو فوری طور پر گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل محسوس نہیں کر رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ نورین کا فون ہوگا۔ وہ پوچھا چاہ رہی ہوگی کہ اب تک وہ اس کے پاس کیوں نہیں پہنچا۔ اس نے ریسپونڈ نہیں اٹھایا اور بستر پر جوتوں سمیت ڈھیر ہو گیا۔

اس روز رات تک بار بار اس کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی مگر اس نے ایک بار بھی ریسپونڈ نہیں اٹھایا۔ رات کو کچھ سوتے

اور کچھ جاگتے ہوئے اسے جیسے عرفان سا ہوا، اس کے اندر سے کوئی آواز ابھری۔ بے وقوف، توہیں شونہن کی دنیا میں خلوص اور محبت تلاش کر رہا ہے۔ ریشہ اور نوریں جیسی عورتوں کے دلوں میں جذبات کا گداز تلاش کر رہا ہے اس پر ہنگامہ اور بے حس شہر میں جاہت ڈھونڈ رہا ہے۔ بے غرضی کے سائے میں پناہ چاہتا ہے، چل گاؤں کی طرف لوٹ جا۔ جہاں محبت بازو پھیلائے نہ جانے کب سے انتظار کر رہی ہے۔ جہاں تیرا بوڑھا باپ تجھے عاق کرنے کے باوجود آج بھی تجھے سینے سے لگانے کو تیار ہو گا۔ جہاں آسیہ تیری تمام تر بے وفائی کے باوجود تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔ گاؤں کی یہ سیدھی اور بھولی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کسی کے نام زندگی لکھ دیتی ہیں تو پھر اس امانت میں خیانت نہیں کرتیں۔ آسیہ۔۔۔ آسیہ! یہ نام بازگشت کی طرح اس کے ذہن میں گونجا اور اس کے حواس پر چھا گیا۔ چنبیلی کی کلی کی طرح سفید اور نرم و نازک سی اس لڑکی کا سراپا آج بھی اس کے حافظے پر یوں نقش تھا جیسے لوح سنگ پر کسی نے تیشے سے کچھ کھود رکھا ہو مگر وہ اس پر ہمیشہ فراموشی کی مٹی ڈالتا چلا آیا تھا۔ پے در پے دو حادثوں نے اس کی روح کو جھنجھوڑا تھا تو فراموشی کی ساری دھول جیسے تیز آندھیوں سے اڑ گئی تھی۔ یہ عہد کرنے کے بعد اسے نہایت سکون کی نیند آگئی کہ صبح وہ ضرور گاؤں جائے گا۔



وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا مبادا نورین کا کوئی آدمی اسے بلانے نہ پہنچ جائے۔ اس میں کسی کو ٹھکانے، سختی سے قطع تعلق کا اعلان کرنے یا کسی کو اس کے منہ پر اس کی خود غرضی اور بے وفائی کا طعنہ دینے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ایسے معاملات میں وہ صاف بات کرنے یا سامنا کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے والا آدمی تھا۔ چار گھنٹے کی تیز ڈرائیونگ کے بعد وہ دوپہر کے قریب اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ گلیاں کافی حد تک ہموار ہو چکی تھیں اور کم از کم اس کے اپنے گھر تک راستہ ایسا ضرور تھا کہ وہ کار آسانی سے لے جا سکتا تھا۔ کچھ بچے اس کی کار کے پیچھے دوڑے، کچھ گتے بھونکتے ہوئے پکے مگر ظفر کو جیسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ بالکل گم سم سا تھا۔

وہی مانوس سی گلیاں، وہی جانے پہچانے درخت اور وہی شناسا سے درو دیوار مگر چہرے جیسے کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ راہ چلتی اکا دکا عورتوں اور مردوں نے رُک کر تجسس سی نظروں سے اسے اور اس کی گاڑی کو دیکھا مگر کسی نے اسے

آواز نہیں دی تھی حالانکہ ان میں سے چند ایک کو ظفر پہچانتا تھا مگر وہ شاید اب اسے نہیں پہچانتے تھے۔

اپنے مکان کے سامنے گاڑی روک کر وہ اتر اور تیزی سے اندر چلا گیا مگر اسے چونک کر رکنا پڑا۔ مکان کے طویل و عریض صحن میں درختوں کی چھاؤں میں بچے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ برآمدے میں بھی بچے تھے۔ کمروں میں سے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ صحن اور برآمدے میں بلیک بورڈ اسٹینڈ پر کھڑے تھے۔ ایک درخت میں گھنٹی لٹکی ہوئی تھی۔ ایک طرف پانی کا حوض بنا ہوا تھا جس پر کچھ لڑکے بیٹھے تھمتیاں دھو رہے تھے۔

درختوں کی چھاؤں میں کرسی پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتا ہوا نوجوان اشرف تھا۔ ظفر اسے پہچانتا تھا اور جب ظفر نے دھوپ کی عینک اتاری تو اس نے بھی ظفر کو پہچان لیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا پھر نہ جانے کیوں سمجھتے ہوئے کچھ فاصلے پر ہی رک گیا۔

”یہ ہمارے گھر میں اسکول کب سے کھل گیا ہے اشرف؟“ ظفر نے دھیرے سے پوچھا۔

”تمہیں شاید علم نہیں کہ تمہارے آبا انا مکان اور جو تھوڑی بہت زمین تھی سب محکمہ تعلیم کے نام کر گئے تھے۔“ اشرف نے اپنی گردن میں لپٹا ہوا مفکر قدرے ڈھیلا کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا ان کا۔۔۔۔۔“ ظفر کی آواز گلے میں پھنس گئی۔

”ہاں۔۔۔ شاید تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ ان کا پچھلی صدیوں میں انتقال ہو چکا ہے۔“ اشرف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اصل انہوں نے وصیت کی تھی کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔ تمہیں ان کے انتقال کی خبر نہ دی جائے۔“

ظفر چند لمحے گم سم سا کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ دھوپ کی عینک لگالی تاکہ اشرف اس کی آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے کیونکہ یہ غم سے زیادہ ندامت کے آنسو تھے۔ وہ تیزی سے مڑا اور باہر گاڑی میں آ بیٹھا چند لمحے بعد اس نے عینک اتار کر رومال سے آنکھیں پونچھیں اور گاڑی تھوڑی آگے بڑھا کر دوسرے گھر کے سامنے جا روکی۔ گھر کا دروازہ چوٹ کھاتا تھا اور سامنے ہی چند بوڑھی بوڑھی عورتیں بیٹھی سوت کی اٹیاں لپیٹ رہی تھیں، ان میں آسیہ کی ماں نظر نہیں آرہی تھی۔

ظفر کو متوجہ پا کر ایک بڑھیا اٹھ کر دروازے پر آئی ”کس سے ملنا ہے بیٹا؟“ اس نے پوچھا۔

”گلشن بی بی سے“ ظفر نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ گلشن، آسیہ کی ماں کا نام تھا۔

”وہ تو کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے بیٹا! بڑھیا نے آہ بھر کر کہا۔“ سانپ نے کاٹ لیا تھا اسے۔“

ظفر کو ایک اور دمچکا سا لگا۔ کیا اس کا رابطہ گاؤں سے اتنے ہی طویل عرصے سے ٹوٹا ہوا تھا کہ اس دوران یہاں جانے کیا کیا تیا متیں بیت گئی تھیں۔ ظفر کو تو اپنا گاؤں سے جانا کل ہی کی بات معلوم ہو رہی تھی لیکن شاید وقت کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ کیسا بد نصیب تھا وہ کہ باپ کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا۔ دم آخر اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی غلطیاں بھی معاف نہ کر سکا۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس ضعیفہ نے ایک اور افسوسناک خبر سنادی تھی۔

”اس کی ایک لڑکی بھی تھی اماں جی۔۔۔“ ظفر نے مشکل تمام سنبھل کر کہا۔ ”آسیہ نام تھا۔ اس کا۔۔۔ کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتی؟“

”یہ مکان تو بیٹا گلشن کی زندگی میں ہی کھڑی والوں کے پاس گروی رکھا ہوا تھا۔ بڑھیا نے آنکھیں سکیڑ کر گویا اسے پہانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔“ گلشن کے انتقال کے بعد انہوں نے لے لیا۔ آسیہ بڑے چوہدری صاحب کے ہاں لوکری کرتی ہے اور وہیں رہتی ہے۔“

بڑی بی کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی آسیہ کی شادی نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتی۔ شاید اس سے مل کر کرب سسل کی اس دھوپ میں مسرت کے کسی خفیف سے جھونکے کا لمس محسوس ہو۔ ظفر نے اس تیراک کی طرح سوچا جو محض تھک جانے کی وجہ سے ڈوبنے کے قریب ہو۔ اس نے گاڑی موڑی اور واپس چل دیا۔ بڑے چوہدری صاحب جن کا نام رحمت علی تھا ان کی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر آتی تھی۔ حویلی کے سامنے ایک بڑا سا میدان بھی خالی پڑا تھا۔ ٹاؤن کمیٹی کے نقشے کے مطابق یہ کھیل کا میدان تھا مگر آج تک اس میں کسی جوان کو تو کیا کسی نابالغ کو بھی کھیلنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

چوہدری رحمت علی صاحب محض جاگیردار ہی نہیں، علاقے کی معروف سیاسی شخصیت بھی تھے۔ ہر دور حکومت میں ان کی کوئی نہ کوئی سرکاری درباری پوزیشن رہتی تھی۔ بڑا ویدہ تھا ان کا۔ مگر ظفر احمد چونکہ ایک مدت سے ان کی رعایا میں شامل نہیں تھا اور وہ خود بھی ماحجوں ماحجوں میں شمار نہیں رہا تھا اس لیے وہ سیدھا حویلی کے دروازے پر گاڑی لے گیا۔ ایک ادھیر عمر سی عورت کپڑوں کی ایک گھڑی اٹھائے، ناک

شکری ایک بچی کا ہاتھ پکڑے باہر آرہی تھی۔

”سنو ماسی! ظفر نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔“

”چوہدری صاحب کی نوکرائیوں میں ایک لڑکی ہوگی آسیہ، گلشن بی بی کی بیٹی آسیہ۔ ذرا اسے بھیجو۔ کہنا۔۔۔ کہنا کہ شہرے متہاری۔۔۔ پھوپھی۔۔۔ نہیں پھوپھی نہیں، خالہ کا بیٹا ظفر آیا ہے۔“

”بابو صاحب! عورت سہمی سہمی نظروں سے پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔“ اگر آسیہ سے ملنا ہی ہے تو پیچھے والے چھوٹے دروازے پر آجاؤ۔ اصطبل کے قریب۔ میں اسے بھیجتی ہوں۔“

وہ دوبارہ اندر چلی گئی اور ظفر حویلی کے گرد چکر کاٹتا ہوا پیچھے آگیا۔ پچھلی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا جو غالباً صرف اصطبل میں جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اصطبل وہاں سے چند ہی قدم آگے تھا۔

چند لمحوں بعد متوحش سی ایک عورت باہر آئی۔ تیل میں چمڑے ہوئے اس کے بال سختی سے سر سے چمڑے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی بھی جھلک آتی تھی۔ اس کی رنگت اس قدر زرد اور رخساروں کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی تھیں کہ سلی نظر میں وہ ٹی بی کی مریضہ لگتی تھی۔ اس کے تن پر میلے اور بد وضع کپڑے تھے جو شاید اس کے اپنے نہیں تھے۔ جسم ڈھلکا ہوا اور آنکھیں ویران تھیں و مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئی آرہی تھی۔ ان ہاتھوں پر انٹی طرف نیلی نیلی نیس ابھری ہوئی تھیں اور ہتھیلیوں پر لکیروں میں سیاہی سمٹ آئی تھی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی اجلی اجلی آسیہ تھی جس پر حبیبی کی کلی کا گمان گزرتا تھا۔ کسی انجانے ہاتھ نے اس کلی کو بدنمائی کی راکھ میں دفن کر دیا تھا۔ وہ کار کی کھڑکی کے قریب اکھڑی ہوئی لیکن سہمی سہمی نظروں سے پیچھے بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو ظفر سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ اس کا گلا پلے ہی رندھا ہوا تھا۔ لڑکپن کی محبت کے اس کھنڈر کو دیکھ کر تو جیسے اس کی زبان بھی پتھر کی ہو گئی۔

”اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟“ بالآخر آسیہ نے اکھڑے اکھڑے سے ہنسنے میں کہا۔

”تمہیں لینے۔“ بے اختیار ظفر نے سرگوشی کی۔ یہ اس کی ذات کے کھنڈر میں دم توڑتے ہوئے جذبے کی بازگشت تھی۔

”ہونہ۔“ آسیہ کے چمڑے ہوئے سے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ آگئی۔ ”مردوں کی یہی خاصیت ہوتی ہے جب وہ ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، ٹھکرادیے جاتے ہیں تو اپنی اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس وقت گو کہ میں بھی شکست خوردہ ہوں، اپنی ہی نظروں میں گر چکی ہوں مگر یہ مت سمجھو کہ

تہیں دیکھتے ہی میں باچیں اور بائیں پھیلائے تمہاری طرف دوڑی چلی آؤں گی۔ میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے سب کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

”کیوں؟ آخر کیوں؟ ظفر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ اسٹیزنگ وکیل پر اس کی گرفت اس قدر سخت ہو گئی کہ کھر دری رٹہ کا کوئی کانٹوں کی طرح اس کے ہاتھوں میں چبھنے لگا۔

”ایک سال تک وہ جیبت چوہدری جس کا نام رحمت کی بجائے عفریت ہونا چاہیے تھا۔ مجھے درندوں کی طرح بھنبھوٹتا رہا مگر کوئی نہ تھا جسے میں پکارتی جو آکر مجھے اس کے خشک سے نجات دلاتا۔ جس نے صرف دو وقت کی روٹی کے عوض مجھے

اپنی ملکیت میں لے لیا تھا اور گاؤں میں اس کی پجڑی کا طرہ کچھ اور اونچا ہو گیا تھا کہ چوہدری صاحب کس طرح بیواؤں اور یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔۔۔ میں بھاگ کر بھی کہاں جاتی؟

کس کے پاس جاتی؟ اس عفریت سے نجات حاصل کر سکتی تو بھوک کے عفریت سے کیسے لڑتی؟ اندھا دھند نکل کھڑی ہوتی تو قدم قدم پر نہ جانے کتنے چوہدری ملتے۔ ماحول کی دہشت اور میری تنہائی نے مجھے مغلوب کر لیا۔ میں بھینٹ کا جانور بن گئی۔۔۔

آسیہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا اور وہ گھٹی گھٹی لیکن ہندیانی سی آواز میں بولے جا رہی تھی پھر یکایک اس کے ہجے میں ٹھہراؤ مگر انتہا کا زہر لایا اور کاٹ پیدا ہو گئی۔

”اور پھر میں ایک بچے کی ماں بھی بن گئی مگر وہ بچہ پیدائش کے فوراً بعد ہی میری گود سے نوحہ کر ایک اور شرعی طور پر شادی شدہ، اور بچوں والی نوکرانی کے بچوں میں شامل کر دیا گیا کیونکہ

چوہدری صاحب کو یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ ان کی نوکرانیوں میں سے کوئی ناجائز بچے کی ماں مشہور ہو۔ وہ بچہ اس حویلی میں پرورش پا رہا ہے۔ میں اسے دور دور سے دیکھتی ہوں مگر مجھے اتنی اجازت نہیں ہے کہ میں اسے مل سکوں یا اسے

بٹا کہ سکوں۔۔۔ اور اب ایک چھوڑی ہوئی بڑی کی طرح مجھے ایک طرف پھینک دیا گیا ہے۔۔۔ یہ سب کچھ بہت جلد ہی ہو گیا۔ اور بیت رہا ہے۔۔۔ اور اب تم آگئے ہو مجھے لینے۔

۔۔۔ ہو نہ۔۔۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔۔۔ نہیں دیکھنا چاہتی میں تمہاری شکل۔۔۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ اس پر ایک بار پھر ہندیانی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور اسی ہندیانی سی کیفیت میں اس نے ظفر کے منہ پر قہقہہ دیا۔ پھر وہ اپنے پیلے اور پوند زدہ دوپٹے سے منہ پونچھتی ہوئی واپس حویلی کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

ظفر کی کار کے گلو و کپارٹمنٹ میں بھرا ہوا ریو اور موجود تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ ریو اور لے کر حویلی میں گھس جائے اور چوہدری اور اس کے بعد اس کا جو بھی حمایتی سامنے آئے اس کے سینے میں سوراخ کر دے۔ اپنی جان جانے کی اسے اتنی پروا نہیں تھی مگر یہ سوچ کر اس کا ہیجان ختم ہو گیا کہ اس طرح بھی وہ آسیہ کو اس کا وہ سب کچھ واپس نہیں دلا سکتا تھا جو لٹ چکا تھا۔ اس کا کنوارا پن۔ اس کی جوانی۔ اس کی پاکیزگی۔ اس کے بچے کے جائز ہونے کی سند۔ اس کے احساسات اور محبت پر اس کا یقین۔ وہ کچھ بھی تو آسیہ کو نہیں دلا سکتا تھا۔

اس نے گاڑی موڑی اور ماؤنٹ ساذہن لیے گاؤں سے واپس روانہ ہو گیا۔ وہ گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔

شہر اور گاؤں کے تقریباً درمیان ایک چھوٹی ٹرک کو بڑی ٹرک سے ملانے والے راستے میں ایک پل آتا تھا جس کے نیچے ایک خاصی چوڑی تیز و تند سی نہر بہتی تھی۔ اس کی گہرائی بھی کم نہیں تھی۔ اس نہر کے پل پر پہنچ کر ظفر گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا اور کار زنگ آلود سے جنگلے کو توڑتی ہوئی نہر میں جا گری۔

اخبارات نے لکھا تھا کہ گرتے وقت کار کا دروازہ چونکہ کھل گیا تھا اور اس حادثے کا علم بھی کئی گھنٹے بعد ہو سکا تھا اس لیے ظفر کی لاش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ بعد میں نہر میں بہت آگے جا کر جال لگائے گئے اور دوسری طرح بھی کوششیں کی گئیں مگر لاش کو شاید مچھلیاں کھا گئی تھیں۔ بہر حال بڑا دردناک حادثہ تھا۔ اخبارات میں کالم لکھے گئے تھے اس پر خصوصاً نسلی

اخبارات میں تو کافی دنوں تک مضامین وغیرہ چھپتے رہے تھے۔ ”جانوروں والے بابا، نے ظفر احمد کی کہانی ختم کر کے اپنی چھڑ جھنکار ڈاڑھی کھجاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔ میرا

دوست سہیل بول اٹھا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔۔۔ میں نے اخبارات میں پڑھا تھا اس حادثے کا احوال۔۔۔ اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ظفر احمد کیسا مقبول گلوکار ہوا کرتا تھا۔“

”مجھے بھی یاد ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”یا یوں کہو کہ ابھی یاد آیا ہے۔ حالانکہ اس حادثے کو کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ دراصل زندگی کچھ ایسے سانچے میں ڈھل گئی ہے کہ دلوں پر گزرا ہوا بڑے سے بڑا سانحہ ہم بہت جلد بھول جاتے ہیں۔

ہمیں صرف اپنے معائب یاد رہ جاتے ہیں۔“

”درست کہتے ہو۔“ جانوروں والے بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے لمبے لمبے، میل بھرے، اُلجھے اُلجھے بالوں کی نیس اس کی پیشانی سے چہرے پر ڈھلک آئیں جنہیں اس

نے ادھر ادھر ٹہا کر واڑھی اور مونچھوں کے صھاڑ جھنکار میں ملا دیا۔

اس جانوروں والے بابا کا، بابا، ہونا بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے بالوں میں کم از کم ہیں تو ایک بھی بال سفید نظر نہیں آیا تھا مگر وہ بابا مشہور تھا۔ جی ہاں مشہور تھا۔ حالانکہ وہ آبادیوں سے میلوں دور جنگل میں رہتا تھا۔ یہاں سے قریب ترین آبادی رانی پور تھی جو کم از کم تین میل کے فاصلے پر تھی اور وہاں ہم کبھی کبھار آتے رہتے تھے۔ وہیں ہم نے بار بار اس کا ذکر سنا تھا۔ لوگ کہتے تھے بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے مگر کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ لوگ مصیبت اٹھانے اس کے پاس پہنچتے ہیں تو آگ بگولا ہو جاتا ہے جھونپڑی کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سودا سلف لینے یا یوں کہیے کہ مانگنے آ جاتا ہے۔ اس کے پاس تھوڑے بہت پیسے بھی ہوتے تھے جو نہ جلنے کہاں سے آتے تھے حالانکہ وہ پیسے کسی سے مانگتا نہیں تھا۔ وہ سودا سلف کے بدلے کچھ پیسے کسی دکاندار کو دینے کی کوشش کرتا تو وہ لیتا ہی نہیں تھا۔ وہ رانی پور تک پہنچتا بھی معلوم نہیں کیسے تھا اگر بس والے اسے بٹھالیتے تھے تو یہ ان کے حوصلے کی دلیل تھی کیونکہ اس کے جلو میں ہمیشہ چار پانچ کتے، دو تین بلیاں، کندھوں پر دو چار کوتے، کبوتر اور چڑیاں طوطے ہوتے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ گلی کو چوں میں سے گزرتے وقت دو چار پرندے اس کے سر سے چند فٹ اوپر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگے تھے۔ لوگ کہتے تھے اسے ہر حیوان کی زبان آتی ہے اور یوں وہ جانوروں والا بابا، مشہور تھا۔

میرے اور سہیل کے ساتھ قصہ یہ ہوا تھا کہ ہم خرگوشوں کا شکار کھیلنے جنگل میں آئے تھے اور اپنے آپ کو زمانہ جدید کا جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن سمجھتے ہوئے جیب میں بیٹھ کر آئے تھے۔ جیب سہیل کی ملکیت تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کے والد محترم کی ملکیت تھی۔ اس سے پہلے ان کے والد محترم کی۔۔۔ اس سے آگے میں نے پوچھا نہیں تھا ورنہ شاید ملکیت کا یہ سلسلہ کچھ دراز ہو جاتا۔ یہ جیب خرگوشوں کے تعاقب میں کھجورے کی رفتار سے دوڑتی تھی۔ شام تک ہم اپنے کارٹوس ضائع کر چکے تھے کہ شاید خرگوشوں کو ہی شرم آگئی تھی اور ایک خرگوش خود ہی میری بندوق کے سامنے آ گیا تھا۔ شاید یہی خرگوش تھا جس نے کھجورے سے شرط بد کر دوڑ لگائی تھی اور راستے میں سو گیا تھا۔

قدرت کو شاید یہ دخونیزی، پسند نہیں آئی اور چند



منٹ بعد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک تو جنگل کی زمین کیچڑ میں تبدیل ہو گئی اور پتے جیب خراب ہو گئی جس پر مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے تو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اب تک کیونکر چل رہی تھی۔ جیب کو چونکہ سہیل کی ملکیت میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لیے وہ بھی اس کے اسرار و رموز سے آنا زیادہ واقف نہیں تھا اور جہاں تک میرا سوال تھا تو گاڑیوں کے بارے میں میرا علم یہیں تک محدود تھا کہ ان کا انجن عموماً بونٹ کے نیچے ہوتا ہے۔

ہم جنگل میں ذیل و خوار ہوتے پھر رہے تھے جب وہ ہمیں سامنے سے آتا دکھائی دیا تھا۔ ہم نے گو کہ اسے پہلے بھی دیکھا نہیں تھا لیکن اب دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ وہ جانوروں والا بابا تھا کیونکہ حسب روایت دو چار کتے، بلیاں اور چرند پرند اس کے ہمراہ تھے۔

میری اور سہیل کی صورتوں سے چپکتی ہوئی طاقت دیکھ کر لوگوں کو ترس آ جاتا ہے اور اس وقت ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شاید اسی لیے جانوروں والا بابا ہمیں اپنی جھونپڑی میں

لے آیا تھا۔

اس نے ہمارے لیے الاؤ دیکھایا، چائے بنائی اور پھر ہمیں کچھ کھانے کو بھی دینے کی کوشش کی لیکن برتن اس قدر گندے تھے کہ تیز بھوک کے باوجود ہمارا کھانے کا حوصلہ نہ پڑا اور ہم نے بھوک نہیں ہے، والے مشہور عالم بہانے کا سہارا لیا۔ اس نے بھی کچھ زیادہ اصرار نہیں کیا۔

بستر، یالیوں کیسے کہ گڈری بھی صرف ایک ہی تھی اور وہ بھی اس قدر گندی کہ جانوروں والے بابا کے کتے بلیاں بھی اس میں سونا پسند نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے الاؤ کے پاس بیٹھ کر ہی رات بتانے کا عزم کر لیا تھا۔ جانوروں والا بابا بھی رات جگے میں ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ جب وقت گزارنا دوبھر ہو گیا اور رات شیطان کی آنت سے زیادہ لمبی محسوس ہونے لگی تو میں نے جانوروں والے بابا سے کہا تھا: بابا، کوئی بات ہی سناؤ۔۔۔ کوئی قصہ۔۔۔ کوئی کہانی۔۔۔ کوئی گانا۔۔۔ کوئی ماہیا۔۔۔ میر۔۔۔ کچھ بھی سناؤ مگر خدا کے لیے یوں چپ بیٹھ کر ٹکڑا ہاری طرف مت دیکھو۔

تب بابا نے ہمیں ہیر سنانی شروع کر دی تھی۔ مگر ہیر بھی آخر تک چلتی۔ جلد ہی کھیرے اسے ڈولی میں ڈال کر لے گئے۔ تب میں نے بابا سے فرمائش کی تھی: بابا، کوئی لمبی سی کہانی سناؤ، بابا چند لمبے الاؤ کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب وحشانہ سی چمک آگئی یا شاید یہ الاؤ کا انعکاس تھا۔ پھر اس نے عجیب سی نظروں سے باری باری ہماری طرف دیکھا۔ شاید وہ مسکرایا بھی تھا مگر اس کے ہونٹ چونکہ بالوں میں چھپے ہوئے تھے اس لیے ہم اس کی مسکراہٹ دیکھ نہیں سکے۔

”میں تمہیں ایک بد نصیب اور محروم تمنا انسان کی کہانی سناتا ہوں“ اس نے کہا تھا اور پھر ہمیں گلوکار ظفر احمد کی کہانی سنائی تھی۔

اب صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ رات بہر حال کٹ ہی گئی تھی۔ ہم نے جانوروں والے بابا کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہمیں صبح راستے تک چھوڑنے کے لیے ہمارے ساتھ چل دیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ سب میں بیٹھ کر رانی پور جائیں گے اور کل پرسوں کسی مکینک کو ساتھ لے کر آئیں گے۔

بابا کے جانور بھی اس کے ساتھ تھے بلکہ ادھر ادھر خنق پر چھپاتے ہوئے کچھ پرندے بھی اسکے سر پر چکر کاٹتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ سہیل نے اپنی دانست میں بابا کی نوازش کا بدلہ چکانے کے لیے کہا: بابا، تم یہاں کیا اتنے دور افتادہ

جنگل میں اکیلے پڑے ہوئے ہمارا دل نہیں گھبراتا۔ شہر آ جاؤ۔ میرے آبا پی ڈیوڈی میں ہیں۔ میں تمہیں کوئی گوارڈ وغیرہ دلا دوں گا۔

بابا نے عجیب سی نظروں سے سہیل کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کی بات سے محفوظ ہوا ہو پھر اس نے عجیب سے انداز میں بند آہنگ تہقبہ لگایا اور بولا: میں سکھ، سکون اور محبت کا بجاری ہوں۔۔۔ اور سکھ سکون اور محبت اب نہ شہر میں رہ گئی ہے اور نہ ہی گاؤں میں۔ پھر اس نے ہماروں طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کیا: ”سکھ اور سکون اب صرف یہاں رہ گیا ہے۔“ پھر اس نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے کتوں کی پیٹھ تھپتھائی اور پرندوں کو سہلایا اور کہا: اور محبت صرف ان بے زبانوں میں رہ گئی ہے۔ صرف یہی ہیں جو تمہیں محبت کے جواب میں محبت دیتے ہیں۔ کھوٹ سے پاک محبت۔

دفعۃً وہ رُک گیا اور سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اب یہاں سے تم ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔ سیدھے سڑک پر پہنچ جاؤ گے“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور واپس چل دیا۔

میں اور سہیل کافی دیر تک کچے راستے پر سر جھکائے چلتے رہے۔ دفعۃً سہیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”یار۔۔۔ جانوروں والے بابا کی آنکھیں، ناک اور پیشانی مانوس سی کیوں لگ رہی تھیں؟ جیسے ہماری کوئی پرانی بھولی بھری سی چیز اچانک کہیں مٹی میں آدھی دبی ہوئی نظر آ جائے؟“ ”میں بھی یہی سوچ رہا تھا“ میں نے جلدی سے کہا۔ اور تم نے یہ محسوس کیا کہ اس نے ہمیں ہیر کیسی سرلی آواز میں سنائی تھی؟

”ہاں۔۔۔ اور میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ اس نے ہمیں ظفر احمد ہی کی کہانی کیوں سنائی؟“ سہیل اچھن آمیز لہجے میں بولا: ”تم نے جب اس سے فرمائش کی تو میرا خیال تھا کہ وہ کسی آسیب زدہ حویلی یا آدم خور شیر کی کہانی سنائے گا۔“ ”میرا بھی یہی خیال تھا“ میں نے تائید کی۔ اور ہم کتنے احمق ہیں۔ لوگ شاید ہمیں بے پروا کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم نے بابا سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ آخر اسے ظفر احمد کی زندگی کی ہر بات کا علم کیونکر ہوا؟

سہیل سر جھٹک کر بولا: ”چلو یار۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو گولی مارو جانوروں والے بابا کو۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کھانوں کی باتیں کرتے ہیں“

